جلد 12 شمارہ 12 نومبر 2010ء ذوالحجۃ 1431ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

محبت

اللہ

صداقت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

منشور دعوت

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

(ال عمران-175)

ترجمہ

یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔ اگر تم مومن ہو تو اِن سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا۔

ماہنامہ
گوجرانوالہ
آدمیت سے فلاح
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان
کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد **خواجہ عبدالحکیم انصاری** رح
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
Mob: 0300-6493335

مدیر : احمد رضا

نائب مدیر : پروفیسر محمد احمد شاد

تقسیم کنندہ : نعمان احمد
0300-6452570

ڈیزائنگ اینڈ کمپوزنگ : محمد رفیق

مجلس ادارت

خالد مسعود، پروفیسر منیر احمد لودھی
ائیر کموڈور (ر) اعجاز الدین
پیر خان، عتیق احمد عباسی
ایم طالب، عبدالقیوم ہاشمی،
پروفیسر غلام شبیر شاہد

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ کے لئے

مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ)
وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
055-4005431

رابطہ مدیر: 0321-6400942
فیکس نمبر: +92-55-3736841
ای میل: info@toheedia.net

قیمت شمارہ ———— -/25 روپے
سالانہ فنڈ ———— -/250 روپے

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

اس شمارے میں

حضرت ہشیمؓ بن عتبہ

(طالب الہاشمی)

یہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری کا دن تھا۔

اِس دن مدینہ منورہ سے اَسی میل کے فاصلے پر بدر کا میدان ایک تحیر خیز منظر پیش کر رہا تھا۔

سورۃ کا آغاز قرآنِ کریم کی عظمت اور منزل من اللہ (اللہ کی طرف سے نازل شدہ) ہونے کے ذکر کے ساتھ ہے اور اس حقیقت کا ذکر واشگاف الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اس قرآن سے فائدہ صرف انہی لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو قرآنی تعلیمات پر ایمان لا کر اپنی عملی زندگی میں اس کی ہدایات اور احکام پر عمل پیرا ہوں۔

ایمانیات کے سلسلے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آخرت پر ایمان اور جوابدہی کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ عقیدہ کمزور پڑ جائے تو انسان دنیا کی زندگی پر فریفتہ ہو کر اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے جس کا لازم اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص میں احساس ذمہ داری نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

آسمانی تعلیمات کے نزول کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی زندگی مختلف طبقوں میں ڈھل جاتی ہے جن کو اس سورۃ میں عبرت و نصیحت کیلئے بیان کیا گیا ہے۔

فرعون قوم ثمود اور قومِ لوط کا ذکر اس سورۃ میں ہوا تا کہ اہل مکہ کو خبردار کیا جا سکے کہ بتاؤ کہ یہ اللہ کے غضب کا شکار قومیں جن نظریات پر قائم تھیں، کیا تم خود انہی میں مبتلا نہیں ہو؟

اسبابِ ضلالت و گمراہی کے ضمن میں شرک اور آخرت سے بے نیازی کے نظریے کا ذکر بھی ہوا کیونکہ جب کوئی شخص اس نظریے پر کاربند ہو جائے کہ زندگی یہی ہے اور اس کے بعد جوابدہی یا احتساب نام کی کوئی چیز نہیں ہو گی تو ایسے شخص میں حق و باطل کے امتیاز کی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور انجام کار وہ اصلاح کی دعوت دینے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور اپنی بدکاریوں پر مصر رہتا ہے اور پھر عذابِ الٰہی ایسے شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ زمین کو اس کے فساد سے پاک کر دیتا ہے۔

ایسے لوگوں کو ان کی اس غفلت اور ہٹ دھرمی کے باوجود راہِ راست کی دعوت دینا آخرت کا

خوف دلائے رکھنا اور اس کو متنبہ کرنا اس سورت کا خاصہ ہے۔

(ب) سلیمان علیہ السلام کی نبوت وحکومت، جلالتِ شان اور دولت کے ذکر میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے نوازا تھا جس کا تصور بھی اس دور کے لوگوں کیلئے ممکن نہیں۔باایں ہمہ وہ آخرت کی جوابدہی سے ہر وقت خوف زدہ رہتے تھے اور اپنے رب کے حضور سر بسجود ہو کر اس کی حمد وثنا اور شکر ادا کرتے تھے۔انکے نفس میں دُنیا کی آلائشوں اور اس میں انہماک کا شائبہ تک نہ تھا۔

(ج) اِس سورۃ میں ملکہ سبا کا ذکر بھی ہے جو عرب کی دولت مند قوم کی حکمران تھی۔عقیدے کے اعتبار سے وہ مشرک تھی۔اس کیلئے اپنے آبائی نظریات وعقائد کو ترک کر کے اپنی سرداری اور حکمرانی کو باقی رکھنا بھی ممکن نہ تھا مگر جب حقائق سامنے آگئے تو اس سچائی کو قبول کرنے کی راہ میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہ بن سکی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ شرک کے باوجود ملکہ سبا کو آخرت کی جوابدہی کا احساس تھا۔

سورۃ کا اختتام توحید اور عقیدہ آخرت کے تذکرے پر ہے اور اس کے ساتھ یہ وضاحت موجود ہے کہ اس پیغام حق کا قبول کرنا تمہارے لئے فائدہ مند ہے اور نہ ماننا تمہارے ہی نقصان اور خسارے کا سبب ہوگا۔

اخلاقِ حسنہ کے ضمن میں اعمالِ صالح، صلوٰۃ وزکوٰۃ، اصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کی تلقین کے ساتھ برائی کے فروغ، فساد فی الارض اور اغلام ایسے قبیح افعال کی مذمت بھی موجود ہے۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓ تِلْکَ آیَاتُ الْقُرْآنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ (1) هُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِیْنَ (2)

''یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیات ہیں جو ہدایت ہے اور مومنین کیلئے خوشخبری ہے''۔ (النمل)

سورۃ کے آغاز میں کتاب اللہ کی عظمت اور متقین کیلئے اس کے مفید ہونے کا ذکر ہے اور اس کے بعد متقین کے اوصاف وکمالات کا ذکر ہے جس سے متقی کی پہچان آسان ہوگئی اور اس کے ساتھ

ہی ان لوگوں کا ذکر ہے جو کتاب اللہ پر ایمان نہیں لاتے ۔بلا شبہ انکا انجام دردناک عذاب ہے ۔

قصہ موسیٰ علیہ السلام

اِس کے بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے منصب رسالت پر فائز کئے جانے ،معجزات اور فرعون کے دربار میں پیغامِ حق پہچانے کا ذکر ہے جس کی تفصیلات دوسرے مقامات پر بیان ہو چکی ہیں ۔یہاں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اس سرکش قوم کا انجام تمہارے لئے باعث عبرت ہے ۔

سلیمان علیہ السلام کا شکر ادا کرنا

اِس کے بعد داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کو دی گئی نعمتوں کا تذکرہ ہے ۔جس پر سلیمان علیہ السلام نے یہ الفاظ ادا کئے :۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (15)

''اِس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی''(النمل)

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نعمتوں میں برکت عطا کرتا ہے ۔سیدنا سلیمان علیہ السلام کو مختلف جانوروں کی گفتگو سمجھنے کا ملکہ عطا کیا گیا ۔جس کے باعث آپ مختلف جانوروں کا باہمی کلام سمجھ لیتے تھے ۔اِسی سلسلے میں آپ کے ایک سفر کا ذکر ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک چیونٹی کا کلام سنا جو یوں اپنی قوم کو کہہ رہی تھی :۔

ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (18)

''اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہو''۔

عاجزی وانکساری

رَبِّ أَوْزِعْنِیْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ أَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلَى وَالِدَیَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحاً تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ (19)

''اے میرے رب !مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر یہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میری والدین کو عطا کیں اور اس بات کی توفیق دے کہ میں اچھے اعمال کروں جو تیری رضا کا باعث ہوں اور مجھے اپنے رحمت کے ساتھ اپنے نیکو کار بندوں میں داخل کر دے''۔

اِس دُعا میں نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنے کے ساتھ عجز و انکساری کا بڑا ہی دلنشین انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اے میرے رب! مجھے اِس بات کی توفیق دے کہ میں ایسے اعمال کروں جو تیری رضا کا باعث ہوں کیونکہ انسان اگر از خود چاہے بھی تو نیک اعمال کی ادائیگی میں شیطانی طاقتیں حائل ہو کر اس کو راہِ حق سے بہکانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس موقع پر اگر توفیق الٰہی شامل ہو تو انسان راہِ ہدایت پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ بہک جانے کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ دُعا ہے کہ مجھے اپنے نیکو کار بندوں میں داخل کر لے۔ غور کیجئے! اللہ کا ایک جلیل القدر نبی یہ دُعا کر رہا ہے!!

ایک عبرت انگیز واقعہ

اس موقع پر ایک مشہور واقعہ دہرانا مزید فائدے کا باعث ہوگا۔ اولیائے کرامؒ کے حالات میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ محبوبِ سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ عبادت میں مشغول تھے کہ غیب سے آواز آئی:۔

''اے عبدالقادر! ہم نے تیری اِس عبادت اور عجز و نیاز سے خوش ہو کر تیری مغفرت کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب تجھے نماز معاف کر دی گئی''۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جب یہ سنا تو فوراً **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه** پڑھا اور فرمایا کہ اے ابلیس! میرے نانا خاتم المَعصُومِینَ **علیہ التَحِیَّةُ و التَّسْلِیْم** کو مقام محمود کی بشارت دے کر نماز تو قطعاً معاف نہ کی گئی اور میری اِس میدان میں کیا حیثیت ہے؟ غیب سے پھر آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو اپنے علم کی طاقت سے بچ گیا ہے۔ ورنہ اِس طرح میں نے بہت سے عابدوں کو گمراہ کیا ہے۔ اِس پر انہوں نے پھر **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه** پڑھا اور فرمایا کہ لعنتی! دور ہو جا تو مجھے اب علم کے زعم میں مبتلا کر کے بہکانا چاہتا ہے۔ میں علم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بدولت تجھ سے بچ سکا ہوں۔ یہ جواب سن کر ابلیس افسوس کرتا ہوا چلا گیا۔

اب ہم غور کریں کہ ہم محبوبِ سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کے معترف تو ہیں مگر اپنی نیکی و پارسائی پر اس قدر نازاں و خود فراموش ہیں کہ ہمیں فرائض اور واجبات کا خیال تک نہیں آتا۔ اور پھر نام نہاد علماء کا معاملہ تو اور بھی دگرگوں ہے کہ وہ علم کے زعم میں اس قدر مگن ہوتے ہیں کہ اور کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ علماء کی پوری قدر دانی اور حدیث شریف میں ان کی عظمت کے ذکر کے باوصف ایسے لوگ قابلِ رحم ہیں جو دین کا واجبی سا علم حاصل کر کے علماء

کے گروہ میں تو شامل ہو جاتے ہیں مگر ان کی نیک نامی کی بجائے ان کی رسوائی کا سامان زیادہ مہیا کرتے ہیں اور اُمت میں فساد ایسے ہی لوگوں کے باعث ہے۔

تو ذکر تھا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے علم اور دیگر نعمتوں کا شکریہ بھی ادا کیا اور آپ کا سر عجز و نیاز سے اور جھک گیا۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام اور ہُد ہُد کا قصہ

دورانِ سفر میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں سے ہُد ہُد غائب پایا گیا۔ انہیں اس پر شدید غصہ آیا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ واپسی پر اگر اس نے غیر حاضری کی معقول وجہ نہ بتائی تو میں اس کو ذبح کر دوں گا۔ جب ہُد ہُد واپس پہنچا تو اس نے ایک ملک کی ملکہ کے حالات اور اس کی قوم کے عقائد و نظریات کی بابت ذکر کیا۔ اس ملکہ کا نام بلقیس تھا، ان کی قوم سورج کی پرستش کرتی تھی۔ حضرت سلیمان نے اُن کو خط لکھا اور دین کی دعوت دی۔

قرآنِ حکیم اس واقعہ کی یوں حکایت کرتا ہے۔

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ إِنِّيْ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيْمٌ (29) إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيْمِ (30) أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِيْ مُسْلِمِيْنَ (31)
قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِيْ فِيْ أَمْرِيْ مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْراً حَتَّى تَشْهَدُون
(32) قَالُوا نَحْنُ أُوْلُوا قُوَّةٍ وَأُولُوا بَأْسٍ شَدِيْدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانظُرِيْ مَاذَا
تَأْمُرِيْنَ (33) قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ
أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (34) وَإِنِّيْ مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِم بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ
يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ (35) فَلَمَّا جَاء سُلَيْمَانَ قَالَ أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ
اللَّهُ خَيْرٌ مِّمَّا آتَاكُم بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ (36) ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ
بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُم بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُم مِّنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ (37) قَالَ يَا
أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَن يَأْتُونِيْ مُسْلِمِيْنَ (38) قَالَ عِفْرِيْتٌ
مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيْكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِيْنٌ
(39) قَالَ الَّذِيْ عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيْكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ
طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرّاً عِندَهُ قَالَ هَذَا مِن فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ أَأَشْكُرُ أَمْ

أَكْفُرُ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (40)

”ملکہ بولی: اے اہل دربار! میری طرف ایک خط بھیجا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔ خط سنا کر ملکہ نے کہا: اے سردارانِ قوم! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو۔ میں کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے مشورے کے بغیر نہیں کرتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم طاقتور اور لڑنے والے لوگ ہیں، آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔ جب ملکہ کا سفیر سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچا تو اُس نے کہا کہ کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ (اے سفیر!) واپس جا۔ ہم ان پر اپنے لشکر لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اے اہل دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آئیں۔ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا: میں اِسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں، میں اس کی طاقت رکھتا ہوں۔ (یعنی آپ اُٹھ کر بیٹھیں اتنی دیر میں اس کا تخت یہاں پہنچ جائے گا۔) میں امانت دار ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا، وہ بولا! آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے میں اُسے لائے دیتا ہوں۔ جوں ہی سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت اپنے پاس رکھے ہوئے دیکھا، وہ پکار اُٹھا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے، اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے۔ اور اگر کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز ہے“۔

اب اِس طویل قصے میں دو تین باتیں غور طلب ہیں۔ سیدنا سلیمان نے دین کی دعوت دی تو ملکہ ہچکچائی لیکن جب وہ آئی تو اس نے اسلام قبول کیا اور جب اپنا ہی تخت سلیمان علیہ السلام کے ہاں پڑا ہوا دیکھا تو حیران رہ گئی اور ایمان لے آئی۔

مومن اور کافر میں فرق

اِس میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اتنی نعمتیں دیکھیں تو فرمایا **هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ** کہ یہ میرے رب کا فضل اور انعام ہے۔ میری اپنی ذات کا کوئی کرشمہ نہیں ہے۔ مومن اور کافر میں یہی فرق ہے۔ ایک تلنگا آدمی جو کہ فقیر تھا، اس کے پاس پیسہ وغیرہ کچھ نہ تھا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے باعث دولت مل گئی تو کہنے لگا کہ یہ میرا ذاتی علم اور کمال ہے جس کی بدولت یہ سب کچھ ملا ہے۔ کافر کو جب چیز ملتی ہے، وہ اس کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھتا اور اپنی صلاحیت کا نتیجہ سمجھتا ہے اور جب مومن کو وہی چیز ملتی ہے تو اس کو فضل ربی قرار دیتا اور کہتا ہے کہ میرے پروردگار کا مجھ پر فضل ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ مجھے اِس لئے دیا گیا ہے تا کہ دیکھا جا سکے کہ میں خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں یا نہیں۔

یہاں ایک شخص کا ذکر آیا۔ جس کی صفت یہ ہے کہ **عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ** اب پتا نہیں چلتا کہ یہ جنات میں سے تھا یا انسانوں میں سے۔ لیکن اس کو اللہ کی طرف سے الکتاب یعنی آسمانی کتاب کا خاص علم عطا ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اِسے خاص کرامات بھی عطا کیں۔ اس سے زیادہ قرآنِ مجید میں وضاحت نہیں۔ نیز ایک اور اہم بات جو ہم اس قصے میں پڑھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو دین کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئی تو آپ نے اس کا احترام کیا۔ قرآنِ مجید میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کا صرف اتنا ہی ذکر ہے۔

سلیمان علیہ السلام اور یہودی یاوہ گوئی

جیوش Jewish انسائیکلوپیڈیا میں لکھا کہ سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو چھوڑا نہیں، (نعوذ باللہ) ان سے گناہ کیا اور ان سے ناجائز بچے پیدا ہوئے۔ انہی میں سے بخت نصر بھی ہے یعنی اس ناجائز بچے کا بھی ذکر کیا۔ اِسی نے آگے چل کر بیت المقدس کو لوٹا اور تورات کی ساری کتابیں اکٹھی کر کے آگ لگا دی۔ اس کا حکم تھا کہ اگر کسی گھر میں تورات کا ایک بھی صفحہ مل گیا تو گھر جلا دیا جائے گا۔

یہ تاریخی واقعہ ہے جس کی بابت یہودیوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کو نبی بھی مانتے ہیں اور ان کا ملکہ سبا کے ساتھ ناجائز تعلق بھی بتاتے ہیں۔ مزید یہ روایات ملتی ہیں کہ سلیمان کا ملکہ سبا کے ساتھ ناجائز تعلق بھی بتاتے ہیں۔ مزید روایات ملتی ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں تھیں اور داؤد علیہ السلام کی 300 بیویاں تھیں۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ معلومات کہاں سے

لی گئی ہیں۔قرآن وحدیث میں اس بابت کوئی ذکر نہیں ہے۔جہاں بھی سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا ذکر ہے وہاں کس خوبصورتی،عزت ووقار کے ساتھ دونوں شخصیتوں کا نام لیا گیا ہے اور ذرا یہودی لٹریچر (Jewish Literature) پڑھ کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے الزام تراشی کی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تمام برائیاں انہوں نے خود کرنی ہوتی ہیں،اس لئے انبیاء کو بھی اس لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

قصہ لوط علیہ السلام

اہل مکہ کو تنبیہہ کیلئے قوم لوط کی بدکرداری اور لوط علیہ السلام پر کی گئی زیادتی کا ذکر ہے کہ اس قوم کے صرف نو فسادی آدمیوں نے کس طرح اپنی بدعملی کے باعث پوری قوم کو عذاب کی بھٹی میں دھکیلا کہ ان کے گھروں کو اُلٹا دیا گیا اور وہ خطہ آج تک عبرت وموعظت کی تصویر بنا ہوا ہے اہل جہاں کو یہ بتاتا ہے کہ نبی کی مخالفت کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔اِس واقعے کی تفصیلات اِس سے قبل مختلف مقام پر بیان ہو چکی ہیں۔

توحید پر دلائل

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کیلئے کائنات کے آفاقی نظام کو بطور دلیل بیان کیا اور فرمایا کہ غور کرو تا کہ حق شناسی کی نعمت کے حقدار بن سکو۔

ارشادِ ربانی ہے:۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَن تُنبِتُوا شَجَرَهَا أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ (60) أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَاراً وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَاراً وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزاً أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (61) أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ قَلِيلاً مَّا تَذَكَّرُونَ (62) أَمَّن يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَن يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْراً بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (63) أَمَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا

بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ (64)

''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشنما باغ اُگائے جن کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کئے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دئے۔ کیا اللہ کے سوا اور کوئی خدا بھی ان کاموں میں شامل ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ناداں ہیں۔ کون ہے جو بے قرار کی دُعا سنتا ہے جب اسے پکارے اور کون ہے جو اس کی تکلیف رفع کرتا ہے اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی یہ کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو اور کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہیں راستہ دکھاتا ہے؟ کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کی خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی یہ کام کرتا ہے؟ بہت بالا و برتر ہے وہ اللہ، اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور وہ کون ہے جو مخلوق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی ان کاموں میں حصہ دار ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو''۔

ان آیات میں ہمیں اس دنیا میں مشاہدے پر اُکسایا گیا ہے کہ دیکھو یہ پانی، یہ پودے، یہ درخت ، یہ باغ، یہ پہاڑ کس طرح پیدا ہو رہے ہیں اور پھر ساری قوتوں میں ایک ربط (Co-ordination) ضبط اور تنظیم ہے۔ کیا یہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟ یعنی قرآنِ مجید پہلی آسمانی کتاب ہے جس کا مزاج سائنسی ہے جو مشاہدے پر اُکساتا ہے۔ اس کو ہم استقراء (Induction) کہتے ہیں اور یہی اس کا مزاج ہے کہ استخراج (Deduction) کی بجائے اس میں استقراء ہے۔ ایک ایک چیز کا مشاہدہ کروا کے ان میں رابطہ پیدا کرنا اور کلیہ تلاش کروانا۔ اس لئے زمین، آسمان اور مختلف چیزوں کا ذکر کر کے آخر میں یوں کہا کہ ''کون ہے کہ جب کوئی مضطرب و پریشان حال آدمی اس کو پکارتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے، اس کی سنتا ہے اور دُعا قبول کرتا ہے''۔

تین اہم وظائف

ایک واقعہ ملاحظہ کریں، میں سعودی عرب جامعہ کنگ فیصل یونیورسٹی میں تھا وہاں ایک استاد حدیث پڑھاتے تھے ان کا نام شیخ جابر حیاری تھا۔ وہ حدیث کے استاد تھے جن کو حافظ الاسد نے سزائے موت سنادی اور وہ جیل میں بند کر دیے گئے تھے۔ وہاں سے وہ جیل توڑ کر

بھاگ نکلے اور یہاں اُستاد متعین ہوئے ۔ ایک دفعہ ہم اکٹھے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے ۔ دمہ کی وجہ سے ان کا سانس پھول گیا ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جابر! تم جیل تو ڑ کر کس طرح بھاگے؟ تمہارا تو یہ حال ہے کہ تم سیڑھیاں بھی آرام سے نہیں چڑھ سکتے ہو ۔ وہ کہنے لگے آرام سے بیٹھ جاؤ، میں تمہیں بتاتا ہوں ۔ وہ حدیث کے اُستاد اور بہت لائق آدمی تھے ۔ میں نے بھی اپنے بچوں کو اِن کے حوالے کر رکھا تھا کہ ان سے حدیث پڑھیں ۔ انہوں نے کہا کہ سجدے میں میں 3 دُعائیں مانگا کرتا تھا اور روتا تھا اس لئے کہ میں حافظ الاسد کے ہاتھوں نہیں مرنا چاہتا تھا ۔ میں چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شہادت کا رُتبہ دے لیکن اس وقت میں کم عمر تھا اور ابھی کچھ عرصہ دین کا کام کرنا چاہتا تھا ۔ میں روتا اور یہ دُعا مانگتا تھا ۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ـ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ٥

’’اے وہ ذات جو بے قرار شخص کی دُعا کو جب وہ اُسے پکارتا ہے، سنتا ہے، اسے قبول کرتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے‘‘ ۔

اُنہوں نے مزید کہا کہ میں سجدے میں دُعا کرتا تھا ’’یَا حَیُّ یَا قَیُّوْم ‘‘یعنی رو رو کر اللہ کے اس اِسمِ اعظم کا ورد کرتا ۔ آیت کریمہ کثرت سے پڑھتا تھا ۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ٥

کیونکہ یونس علیہ السلام بھی تو مچھلی کے پیٹ میں پھنس گئے تھے ۔ ان کی جیل تو تنگ تھی نہ اُٹھ سکتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے ۔ اُنہوں نے یہ دُعا پڑھی تو اللہ نے فضل کیا اور رہائی مل گئی اور اس طرح اللہ نے مجھے رہائی دلائی ۔

جس دل میں تیری یاد ہے تو صدر نشیں ہے
وہ دل بھی حسیں اس کی محبت بھی حسیں ہے

مسئلہ علم غیب

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ـ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ٥

’’اے نبی ﷺ! اِن سے کہہ دیجئے کہ آسمانوں میں اور زمین میں سوائے اللہ کے اور کوئی

غیب کا علم نہیں جانتا ہے۔(تم جن کے بارے میں سمجھتے ہو کہ وہ غیب کا علم رکھتے ہیں)اِن کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے۔(ان کا انجام کیا ہوگا)''

معلوم ہوا کہ علم غیب اللہ کی خاص صفت ہے اور اس صفت میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اس کائنات کا آغاز بھی ہم نے کیا اور انجام بھی ہم ہی کریں گے کیونکہ اہل مکہ نے یہ کہا تھا:۔

آخرت پر دلائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَئِذَا كُنَّا تُرَاباً وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ (67) لَقَدْ وُعِدْنَا هَذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِن قَبْلُ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ (68)

''جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر (قبروں سے) نکالے جائیں گے۔یہ وعدہ ہم سے اور ہمارے آباءواجداد سے پہلے سے ہوتا آ رہا ہے اور یہ تو صرف لوگوں کی (من گھڑت) کہانیاں ہیں''۔

ان کے جواب میں پھر دعوت فکر ہے کہ

قُلْ سِيْرُوا فِيْ الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (69)

''زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ گنا ہگاروں کا انجام کیسا ہوا؟''

اور پھر نبی کریم ﷺ کیلئے تسلی کے الفاظ بیان فرمائے۔

لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ یعنی آپ ان کے حال پر غم نہ کریں کیونکہ آپ پیغامِ حق پہنچا رہے ہیں۔آپ سے قبل بنی اسرائیل کو بھی اختلاف اور انتشار سے روکا گیا مگر وہ نہ مانے۔پہلے کی طرح اب بھی اللہ تعالیٰ حق و باطل کو الگ الگ کر کے دکھا دے گا۔

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (78)

''بے شک آپ کا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا اور وہ زبردست اور علم والا ہے''۔

اس کے بعد حشر کے ایک منظر کا ذکر فرمایا کہ ہم ہر مجرم طبقے کو الگ الگ جماعتوں میں بانٹ دیں گے اور پھر ان سے باز پرس کی جائے گی۔

اہل بصیرت کیلئے زمین وآسمان کی تخلیق کا ذکر کر کے فرمایا کہ جب صُور پھونکا جائے گا تو پھر

سبھی عاجز ہوکر اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ اِس موقع پر نیک اعمال کی جزا دس گنا اور اس سے بھی زیادہ بڑھا کر دی جائے گی اور بدکار لوگ اوندھے منہ دوزخ میں گرا دیئے جائیں گے۔

عظمت کعبہ

اس کے بعد کی آیات میں ایک عالمگیر اور مسلمہ حقیقت کا ذکر کیا جس کو اہل مکہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ یعنی بیت اللہ اور حرم کعبہ کی عظمت کا ذکر ہے۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَـٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (91) وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ (92) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (93)

''بے شک مجھ کو ارشاد ہوا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو محترم بنایا اور سب چیزیں اس کی ہیں اور یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اس کا حکم بردار رہوں اور یہ بھی کہ قرآن پڑھا کروں تو جو شخص راہِ راست اختیار کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کیلئے! اور جو گمراہ رہتا ہے تو کہہ دیجئے کہ میں تو صرف نصیحت کرنے والا ہوں اور کہہ دیجئے کہ اللہ کا شکر ہے۔ وہ عنقریب تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان لوگے اور جو کام تم کرتے ہو، تمہارا رب ان سے بے خبر نہیں''۔

(درس حدیث)

تربیت اولاد اور ضبط ولادت

(شاہ محمد جعفر پھلواروی)

سنن ابو داؤد میں حضرت عوف بن مالک اشجعی سے حضور اکرمؐ کا ایک ارشاد یوں درج ہے۔

انا وامرأة سفعاء الخدين کھاتین یوم القیمة ۔ واوما بالوسطی والسبابة ۔ امرأة آمت من زوجھا ذاتُ منصب وجمال حبست نفسھا علی یتا ما ھا حتیٰ باتوا وماتوا۔

''میں اور وہ عزت وحسن والی بیوہ عورت جو اپنے یتیم بچوں کے خود کفیل ہونے یا مرنے تک اپنے نفس کو (عقد ثانی سے) روکے رکھے اور اس خدمت یتامی کی راہ میں اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جائے تو ایسی عورت اور میں قیامت کے دن اس قدر قریب ہوں گے جیسے انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی''۔

ہم نے اِس حدیث کو کسی جگہ یتامی کی دست گیری کے سلسلے میں درج کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تائید اِن بے شمار احادیث سے ہوتی ہے۔جن میں یتامی کی پرورش پر اُبھارا اور زور دیا گیا ہے لیکن اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ بیواؤں اور یتیموں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے مسئلے کو دوسرے کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ یا یوں کہیے کہ بیواؤں اور یتیموں میں کسے ایک کے مسئلے کا حل قدرۃً دوسرے کے مسئلے کا حل پیدا کر دیتا ہے۔ اگر بیواؤں کی کفالت کی جائے تو اُن کے یتیم بچوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح یتیموں کے مسئلے کا حل ان کی بیوہ ماؤں کو پس پشت ڈال کر نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کیا عجب کہ ان دونوں طبقوں کی معنوی پیوستگی اور غیر منقطع تعلق و ربط ہی کی وجہ سے عربی لغت میں لفظ ''یتیم'' کا اطلاق ''بے باپ کے بچے'' کی طرح ''بے شوہر'' عورت پر بھی ہوتا ہے جس کیلئے ایک دوسرا لفظ ایامی بھی ہے۔ یہ وحدت معنی خود بتاتی ہے کہ ایامی اور یتامی ایک دوسرے سے گتھے ہوئے اور پیوستہ ہیں اور جب ان کی دشواریوں کا حل تلاش کیا جائے گا تو ایک ہی حل ان دونوں کیلئے حل بن جائے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ ایسا حل بجز تعداد ازدواج کے اور کچھ نہیں۔ یہ تعداد ازدواج کی اجازت اگر مختص افراد کی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کیلئے ہوتی تو اس پر کوئی قید و بند لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

چونکہ اِس اجازت کے غلط استعمال کا امکان بہت زیادہ ہے اس لئے اجازت کے ساتھ ساتھ کئی شرطیں بھی لگا دی گئی ہیں۔مثلاً معاشی فارغ البالی، عدل و انصاف اور جنسی صلاحیت (اگر ضروری ہو کیونکہ یہ ہر جگہ ضروری نہیں ہوتی)۔

اِس موقعے پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں عدل سے مراد صرف ازواج کے درمیان ہی عدل کرنا نہیں بلکہ ازواج کی اولاد کے درمیان بھی عدل ضروری ہے اور یہ بڑے حوصلے والوں کا کام ہے۔اگر متعدد ازدواج لاولد ہوں تو صرف ان ازواج کے درمیان عدل کو قائم رکھنا بھی بلا شبہ بڑے دل گُردے کا کام ہے۔لیکن اگر دوسری بیوائیں اپنی یتیم اولاد کے ساتھ کسی صاحب اولاد مرد کی بیوی بنیں تو اپنی صلبی اولاد اور سوتیلی اولاد کو ایک نظر سے دیکھنا ایسے ہی افراد کا کام ہے جو فوق البشری قوتوں کے مالک ہوں۔

یہاں پیشِ نظر حدیث میں ایسی عورتوں کا ذکر ہے جو خود بھی یتیم (بے شوہر) ہوں اور ان کے بچے بھی یتیم (بن باپ) ہوں۔ہر چند کہ عقد ثانی کی اجازت ان کے لئے بھی ہے اور **وانکحو الایامیٰ منکم** کے عام قرآنی حکم میں یہ بھی آ جاتی ہیں۔لیکن لاولد بیواؤں اور ان صاحب اولاد بیواؤں میں ایک بڑا نفسیاتی فرق ہے جو کبھی نظر انداز نہیں کا سکتا۔مرد اگر صاحب اولاد ہے جب بھی اور لاولد ہے جب بھی، وہ اپنی سوتیلی اولاد کے ساتھ اپنی اصلی اولاد جیسی محبت و دلچسپی نہیں پیدا کر سکتا اور خود عورت کا ذہن بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ایک طرف نئے شوہر کی رضا جوئی کی فکر ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کی توجہ اپنی اس شکمی اولاد کی طرف ہوتی ہے جس سے اس نئے شوہر کو کوئی صلبی تعلق نہیں ہوتا۔

اِس دو دماغی اُلجھن سے بچانے کیلئے بیوہ کو ایک اور بلند منزل کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے مال و جاہ اور اس کے جمال کی کشش مردوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اُسے پیغام نکاح دیں لیکن یہ یک طرفہ حل ہے صرف بیواؤں کا۔انھیں اس کے یتیم بچوں کی فکر بہت کم ہوتی ہے۔اِس حالت میں یہ بچے پدری شفقت سے گویا پھر بھی محروم رہتے ہیں۔اِس پیچیدگی کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایسی بیوہ اپنی تمام قوتوں کو یکسو ہو کر اپنی یتیم اولاد کی تربیت و پرورش اور تعلیم و اصلاح میں لگا دے تو

یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کا دماغ نفسیاتی لحاظ سے دو حصوں منقسم ہو جائے اور پھر بھی کسی ایک کی تکمیل نہ ہو سکے۔ اگر وہ عقد ثانی کرے اور اس کے بعد اور بھی اولادیں ہو جائیں تو ماں تو دونوں کو ایک نظر سے دیکھے گی لیکن باپ کیلئے مطلوبہ عدل کو برقرار رکھنا ایک بڑی نایاب جنس ہے۔

یہاں اس فرمانِ نبوی ﷺ کے پردے میں ایک بڑی حقیقت اور بھی جھانک رہی ہے اور وہ یہ ہے چند افراد کی تربیت و تکمیل جو سوسائٹی کیلئے اچھے افراد ثابت ہوں، ایسی بے شمار اولاد پیدا کرنے سے بہتر ہے جن کی تکمیل ذات کا کوئی مادی و روحانی سامان موجود نہ ہو۔ اگر محض اولاد کی کثرتِ بلاترتیب مقصود ہوتی تو حضور ﷺ ہر بیوہ کو عقدِ ثانی پر زور دیتے، حکم دیتے اور نہ کرنے پر وعید سناتے اور کسی حالت میں ایک بیوہ کو ترکِ عقدِ ثانی پر بشارت نہ دیتے۔ اِس بشارت کا سبب صرف یہ ہے کہ تعدد ازدواج محض تعدد ازدواج کیلئے یا صرف کثرتِ تولید کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کیلئے ہے اور وہ ہے ایامی و یتامی کے مسائل کا حل۔ لیکن ایسے ہی کسی اور اعلیٰ مقصد کیلئے تجرد کی زندگی بھی عبادت ہو سکتی ہے اور وہ ہے یکسوئی کے ساتھ تربیت اولاد۔

ایک اور حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ عقدِ ثانی نہ کرنا بھی ایک واضح ضبطِ تولید ہے۔ کثرتِ تولید تو اِس کی متقاضی تھی کہ ہر عورت کیلئے عقدِ ثانی کو لازمی قرار دیا جائے لیکن یہاں اِس ضبطِ تولید کو۔ بشرطیکہ وہ اعلیٰ مقصد کیلئے ہو۔ ایک ایسی عبادت قرار دیا گیا ہے جو ایک بیوہ کو سبابہ و وسطیٰ کی دو انگلیوں کے برابر قُربِ نبوی کا شرف بخشتی ہے۔ اس کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ جہاں "**تزوجوا الولود الودود**" (خوب جننے والی اور محبت کرنے والی عورت سے نکاح کرو) کے مواقع آ سکتے ہیں وہاں ایسے مواقع بھی آ سکتے ہیں جہاں چند افراد کی تکمیل و تربیت پر قانع رہنے کو بے شمار بے تربیت اولاد پیدا کرنے پر ترجیح حاصل ہو۔

دین اور عبادت

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

دین و دنیا کی غلط اصطلاح

اخلاق کی طرف سے ہماری لاپرواہی کی ایک وجہ "دین و دنیا" کی اصطلاح بھی ہے جو دورِ غلامی میں ہمارے ذہنوں پر کچھ اس طرح سوار ہوگئی کہ اس نے زندگی کی وحدت کو دین اور دنیا کے علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا۔ اس طرح عملی زندگی میں ہم نے بہت سے کاموں کو دنیا داری قرار دے کر دین کی گرفت سے آزاد کرالیا اور اپنی کج فہمی کے باعث یہ فیصلہ کرلیا کہ دنیا داری کے میدان میں نیکی اور پارسائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ دین سے مراد وہ مکمل آئین ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی گذارنے کیلئے انسانوں کو عطا فرمایا۔ اور دنیا حیاتِ ارضی کا نام ہے اور اس کے مقابلے میں قیامت کے بعد نا ختم ہونے والی زندگی کا نام آخرت ہے جو اہلِ ایمان ہوتے ہیں وہ اس دنیا کی پوری زندگی اللہ کے آئین کے مطابق گذارتے ہیں جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کیلئے اصولی ہدایات موجود ہیں۔ یعنی وہ دنیا کو دین کے تحت کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور آخرت کی زندگی کو نہیں مانتے وہ اس آئین یعنی اللہ کے دین کو بھی نہیں مانتے، اپنی زندگی کے سارے کام اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ مختلف قسم کے کاموں کا نام دین اور دنیا نہیں ہے۔ بلکہ کام سارے دنیا ہی کے ہیں اور اس زمین پر بسنے والے سارے انسانوں کو آپ دنیا دار کہہ سکتے ہیں اور اللہ کا دین وہ آئین ہے جو ہر خطا سے مُبرّا ہے اور جسے اپنانے سے دنیا اور آخرت دونوں سدھر جاتی ہیں۔ اس لئے میں یہ کہنے کی جسارت کرونگا کہ "دین و دنیا" کی یہ اصطلاح ہی غلط ہے کیونکہ اس کی ترکیب سے یہ تاثر جنم لیتا ہے کہ دین اور دنیا دو علیحدہ علیحدہ، متضاد اور ایک دوسرے سے مختلف چیزوں کا نام ہے۔ ہمیں قرآن کریم میں کہیں بھی نظر نہیں آئے گا کہ دنیا کو دین کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہو بلکہ ہر مقام پر دنیا اور آخرت کو آمنے سامنے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دو زندگیاں ہیں ایک ہماری موجودہ حیاتِ ارضی ہے جو گھٹیا ہے، ختم ہونے والی ہے اور ہمارے لئے تربیت گاہ اور آزمائش ہے۔ دوسری حیات آخرت ہے جو بہت بڑھیا اور نہ ختم ہونے والی ہے اور جہاں ہمیں ہمارے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ لفظی اور لغوی طور پر بھی دنیا کے معنی ہی اودھر، نزدیک والی، نچلی اور گھٹیا ہے۔ دنیا ادنیٰ کی مونث ہے جس طرح علیا اعلیٰ کی مونث ہے۔ یعنی اس کے مقابلے میں ایک اعلیٰ و برتر زندگی موجود ہے جو حیات آخرت ہے۔ اِسی لئے قرآن میں

خسارہ اُٹھانے والے لوگوں کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اُنھوں نے دین کے کام چھوڑ کر دنیا کے کام کئے بلکہ یہ فرمایا **اَسْتَحَبُّوا الحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ** (نحل۔107)

کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا۔ یہ بھی فرمایا کہ سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے لوگ وہ ہوں گے **اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا** o (کہف۔104)

جن کی ساری تگ ودو دنیا کی زندگی ہی کے لئے برباد ہوگئی۔ اسی طرح سورۃ اعلیٰ کے آخر میں فرمایا کہ ''تم لوگ تو حیات دنیا ہی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بہترین دعا میں **رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً** دنیا میں بھی بھلائیاں اور آخرت میں بھی بھلائیاں طلب کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ کہیں بھی دین مانگنے کا نہیں فرمایا کیونکہ وہ تو کامل صورت میں رسول اللہ ﷺ کے توسط سے عطا کیا جاچکا۔ اسی طرح جہاں کسی ناہنجار قوم کے انجام کا ذکر فرمایا وہاں **خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ** کہا گیا یعنی ان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہوگئیں۔ کہیں بھی دین برباد ہونے کا ذکر نہیں آیا کیونکہ اللہ کا دین برباد ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل ہم انسانی زندگی کی سرگرمیوں کو دین اور دنیا میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں غور فرمایئے کہ بچے کی پیدائش پر کانوں میں اذان دینا، سر منڈانا، عقیقہ کرنا، ختنہ کرنا، بڑا ہونے پر اسے تعلیم واخلاق سے آراستہ کرنا، اسے کوئی ہنر سکھانا، جوان ہونے پر نکاح کا حکم، میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے تو مصالحت کا طریقہ، طلاق اور نکاح ثانی کے مسائل، رزق کمانے اور خرچ کرنے کی حدود، وفات پر جائیداد کی تقسیم کے قوانین، گھروں میں داخل ہونے، میل ملاقات، کھانے پینے، خلوت وجلوت اور سفر وحضر کے آداب، استنجا، وضو اور غسل کی تعلیم، مرد اور عورت کے ستر کی حدود، جرائم کے لئے سزاؤں کا تقرر، دوسری قوموں کے ساتھ صلح و جنگ کے قوانین، مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے بارے میں جو مفصل ہدایات دی گئی ہیں تو ان کاموں کو آپ دین کے کھاتے میں ڈالیں گے یا دنیا کے۔ اگر یہ سب کچھ دُنیا ہے تو پھر قرآن کریم اور سنت رسولؐ میں ان کی موجودگی کا کیا جواز ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ دین ہے تو پھر دُنیا کس چڑیا کا نام ہے۔ دین و دنیا میں دوئی ہماری پست فکر نے پیدا کی

اوراسی نے دینی علوم، دینی کام اور دینی فائدے جیسی مزید اصطلاحوں کو متعارف کرایا۔ درحقیقت دنیا کے کام بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت کے منکر ہیں اور اپنی زندگی خواہشات نفس کی پیروی میں اور اپنی مرضی کے مطابق گزارتے ہیں۔ یہی لوگ کافر اور خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاکر اللہ کے دین کے تحت مولا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ یہ صاحب ایمان اور فلاح دارین حاصل کرنے والے ہیں۔ دین کی وسعت کا اظہار حضور ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتا ہے کہ ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں جن میں سب سے افضل کلمہ طیبہ کا اقرار ہے، حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے اور ان میں سب سے کمتر راستے میں سے کسی مضر چیز کا ہٹا دینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مکمل آئین میں زندگی سے متعلقہ تمام سرگرمیوں کے علیحدہ علیحدہ شعبے وقف ہیں۔ لہٰذا دین چند مخصوص اعمال کا نام ہرگز نہیں بلکہ چند ازلی و ابدی لیکن نظر نہ آنے والے حقائق (ایمان بالغیب) پر قائم ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا کی زندگی احسن طریقے سے گذارنے کے لئے دیا تو پھر ان دونوں میں علیحدگی کا جواز کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ہمارے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ بھائی بھی اپنی کم کوشی اور بے عملی کا اظہار کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ جی ہم تو دنیا دار لوگ ہیں۔ میں ان سے یہی گذارش کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین ہم دنیا داروں کے لئے ہی بھیجا ہے تا کہ ہم اس زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے نہ پھریں۔ دین کی ضرورت جمادات، نباتات، حیوانات اور فرشتوں کو نہیں ہے لیکن ہمارے لئے اس کے بغیر کوئی چارا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا کہ اپنے رسول ﷺ کو دین حق دے کر بھیجا۔ میں اپنے بھائیوں سے یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ کیا حضور ﷺ کے صحابہؓ دنیادار نہیں تھے؟ کون سے کام ہیں جو ہم ان سے زیادہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے شادیاں کیں اور ہم سے زیادہ کیں، ان کے بچے تھے اور ہم سے زیادہ تھے، وہ تاجر اور کسان تھے، مزدور اور گلہ بان تھے، صنعت کار تھے شاہسوار تھے، انہوں نے ہجرت کی جنگیں لڑیں، حکمرانی کی، قاضی اور والی بنے، فوجوں کے سپہ سالار بنے، قوموں کے معلم اور رہنما بنے اور اللہ کا پیغام پھیلانے کے لئے دور دراز سفر کئے۔ بایں ہمہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ سب سے بلند

ہے اور اس دنیا کی دولت اور نعمتیں بھی اِن کے قدموں میں چلی آئی تھیں کیونکہ وہ مولا مرضی والے دنیا دار تھے اور ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور ہم جو بزعم خود دیندار ہیں وہ بھی من مرضی والے ہیں۔ اسی لئے ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے وظیفے اور چلے بلکہ بزرگوں سے عقیدت واحترام کا تعلق بھی دنیا ہی کی خاطر ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ دنیا ہم سے دور دور ہی رہتی ہے۔

ایسی ہی غلامانہ سوچوں نے نہ صرف ہماری روحانی اور اخلاقی حالت کو متاثر کیا بلکہ تعمیر و تسخیر کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر کے سائنسی ترقی کو بھی منجمد کر دیا ہے۔ دین کو اس طرح محدود کر دینے کی وجہ سے زندگی کی سرگرمیوں کے دائرے سکڑتے چلے گئے اور شہ لولاک ﷺ کے شاہین کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ گئے۔ علامہ اقبال غلامی اور آزادی کی زندگی کا فرق بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

(بانگ درا)

عبادت کی حقیقت

اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے قرآن کریم کی ایک بنیادی اور نہایت ہی اہم اصطلاح ''عبادت'' پر کچھ روشنی ڈالیں گے تا کہ بہت سی غلط فہموں سے نجات حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ عربی لغت میں عبد کے معنی غلام ہیں۔ جو شخص کسی دوسرے کے تحت ہو اور اپنی مرضی کا مالک نہ ہو اُسے عبد کہا جاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح مفہوم اپنی مرضی کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی غلامی کرنا ہے۔ ایک عارضی ملازم یا کرائے کا مزدور تو یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ مجھے کیا کام کرنا ہوگا یا کتنے گھنٹے کرنا ہوگا لیکن ایک غلام کے لئے اس قسم کی شرائط

خارج از بحث ہیں کیونکہ اس کا آقا جس وقت بھی اسے جو کام کرنے کا حکم دے گا وہ اسے کرنا پڑتا ہے ۔حقیقی بندگی تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ میں اپنا تن من دھن بیچ ڈالنے کا نام ہے ۔اگر چہ بندگی کی یہ تشریح ہماری سوچوں سے کافی مختلف اور مشکل دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقی فلاح کے حصول کی خاطر ہمیں اپنے انداز فکر اور طرز عمل کو بدلنا ہی ہوگا۔ یہ تجارت تو بڑی ہی بابرکت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے اموال جو اس نے ہمیں بغیر کسی استحقاق کے محض اپنے فضل سے عطا کر رکھے ہیں انہیں وہ بڑی اونچی قیمت کے بدلے خریدنے پر رضامند ہو جائیں اور اعلان فرما دیں۔

اِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُـؤْمِـنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَo (التوبہ۔111)

''اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں کہ ان کے لئے جنت تیار کی ہے''

اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ دائرہ اسلام میں داخلہ گویا اپنی جان اور مال کے حقوق سے دستبرداری کا نام ہے ۔حضور نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر اور آج کل ہم لوگ جو بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو گویا یہ اللہ تعالیٰ سے کئے جانے والے سودے کی توثیق ہے کیونکہ بیعت کی معنی ہی بیچ ڈالنے کے ہیں ۔اگر ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کو غلامی کے معنوں میں قبول کر لیں تو ہمارے ذہنوں کی پیدا کردہ دنیا کے کاموں اور دین کے کاموں والی تقسیم کا طلسم ٹوٹ جائے۔ کیونکہ جب ہم اللہ تعالیٰ کی غلامی میں داخل ہو جائیں تو پھر اپنی مرضی سے دستبردار ہو کر اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت رکھنے کے پابند ہونگے اور زندگی اس کی اطاعت کے لئے وقف ہو جائے گی ۔پھر یہ غلامی تو ذوق وشوق سے اختیار کی گئی اپنے حقیقی محبوب کی غلامی ہے اس لئے یہاں چون و چرا کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے۔

عبادت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ یہ ایک لفظ پورے نظام حیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اللہ کی بندگی پوری زندگی پر محیط انداز فکر اور طرز حیات کا نام ہے اور اس کا نام اللہ کا دین ہے ۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا الہ اور رب تسلیم کر کے اس کی بندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ مسلم کہلاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کی بندگی کے

نظام میں داخل نہیں ہوتے وہ شیطان کے اتباع میں اپنے نفس کے غلام بن کر کفار کے دین یعنی کافرانہ طرز حیات کی پیرو بن کر دنیا و آخرت میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کریم کی ایک مختصر سورت **الْکٰفِرُوْنَ** کی چھوٹی چھوٹی آیات پر غور و فکر کریں تو ہمیں نظر آئے گا اس میں عبادت کے علاوہ کسی دوسری بات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف عبادت کے مفہوم کو مختلف انداز میں آٹھ مرتبہ دہرایا گیا ہے اور آخر میں عبادت کے اختلاف کی بنا پر ہی کفار سے یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے ماسواء کی عبادت والا تمہارا دین تمہارے لئے اور اللہ کی عبادت والا میرا دین میرے لئے۔ معلوم ہوا کہ عبادت اور دین ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر صاف صاف فرما دیا گیا۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ط ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَo (یوسف۔40)

''اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

ہم پیچھے یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے قرب کا حصول ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کیلئے صراط مستقیم کی نشاندہی ہو جانا سالکین راہ خدا کیلئے بہت بڑی نعمت ہے۔ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد اور رسول ہیں اور آپ کیلئے سورۃ یاسین میں فرمایا گیا **اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ** کہ بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں اور صراط مستقیم پر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا اتباع ہی عبدیت ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔ دوسری جگہ مزید واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت یعنی اس کی غلامی اختیار کر لو کہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ط ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌo

(آل عمران۔51)

''بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے تو اسی کی عبادت کرو یہی صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہے''

اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ عبادت کا دائرہ بہت ہی وسیع اور پورے دین پر محیط ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم بھی ہے۔ ہم نے بہت سی کج فہمیوں کی بناء پر صرف نماز کو عبادت سمجھنا اور

کہنا شروع کر دیا۔ اگر چہ نماز اور دوسرے ارکان اسلام عبادت و دین کا بہت اہم حصہ ہیں کہ انہی سے وہ کردار تعمیر ہوتا ہے جس کی بدولت مومن معاملات میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پیش نظر رکھتا اور اس کی نافرمانی سے بچتا ہے لیکن بنیادی ارکان ہی کو پورا دین سمجھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے فرمان **اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ** کے مطابق اللہ تعالیٰ کی یاد کو قلب و ذہن میں تازہ رکھنے کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ اہل ایمان تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کو اپنا رب یعنی آقا مان کر ہر رکعت میں یہ عہد کرتے ہیں کہ زندگی کی آزمائش گاہ میں صرف تیری غلامی کریں گے۔ اس طرح اللہ کے فرمان **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ** کے مطابق نماز ہمیں فحشائے عظیم یعنی اپنے حقیقی آقا و مالک سے بے وفائی یعنی اسے چھوڑ کر دنیا کی محبت میں پھنس جانے اور برائیوں کے ارتکاب سے روک لیتی ہے۔ جس طرح اللہ کی ربوبیت میں کسی دوسرے کو شریک کرنا ظلم و ستم ہے اس طرح اللہ کو چھوڑ کر اس کے ماسوا کی محبت میں گرفتار ہو جانا سب سے بڑی بے غیرتی اور فاشی ہے۔

اس کے علاوہ غور فرمایئے کہ ہمارے دین میں جو عمارت نماز کے لئے وقف ہوتی ہے اس کا نام مسجد یعنی سجدہ گاہ ہے اور اسے معبد یعنی عبادت گاہ نہیں کہا گیا۔ کیونکہ عبادت کی وسعت تو ہماری تجارت، معاشرت، معیشت، عدالت، صنعت و حرفت، تعلیم تربیت، کاشتکاری، گلہ بانی اور حکمرانی سب کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ میری نبوت کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ ساری زمین کو میری اُمت کیلئے مسجد بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح جہاں اُمت مسلمہ کو مسجد کے باہر بھی ہر جگہ نماز ادا کر سکنے کی سہولت عطا ہوئی ہے وہاں اس پر یہ فرض بھی عائد ہو گیا کہ پوری زمین کو مسجد کی مانند مقدس و محترم جانتے ہوئے کسی بھی جگہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے۔

اب ہم آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جن میں صلوٰۃ اور عبادت کو واضح طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

(1) اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْo (طٰہٰ۔14)

''میں ہوں اللہ، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو اور میری یادگاری کیلئے نماز

قائم کرو''۔

(2) يَـٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o (الحج۔77)

''اے ایمان والو رکوع کرتے رہو اور سجدہ کرتے رہو اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تا کہ فلاح پاؤ''

(3) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ o (البینہ۔5)

''اہل کتاب کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور یہی سچا دین ہے''

ان آیات بینات کے علاوہ وتر کی نماز کے دوران دعائے قنوت میں ہم پڑھتے ہیں **اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ** جس کے معنی ہیں کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے لئے نماز پڑھتے ہیں۔اس لئے ہمیں چاہئے کہ عبادت کو قرآن کریم میں بیان کی گئی حقیقت کے مطابق پوری زندگی پر محیط سمجھیں اور اسے صرف نماز تک محدود کر کے نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔

خواہشات اور شیطان

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کو انسان کے لئے پیدا کیا اور انسان کو بے پناہ صلاحیتیں عطا کر کے حکم دیا کہ علم وعقل کے بل بوتے پر سب پر اپنی بالا دستی قائم کر کے اپنی خدمت میں لگا لو۔اولا د آدم ہونے کے ناطے سے دنیا کی ساری قومیں اپنی اپنی بساط کے مطابق سائنسی ترقی کیلئے پیش رفعت کر رہی ہیں۔لیکن فیضانِ سماوی سے محروم اس مادی ترقی نے جہاں نئی نئی ایجادات کی صورت میں زندگی کے لئے بے شمار سہولتیں مہیا کی ہیں وہاں انسان کو لامتناہی خواہشات کے حصول کی دوڑ میں ڈال کر اس کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حیرت انگیز ایجادات کے باوجود بھی چاروں طرف بے اطمینانی اور حزن وخوف کی حکمرانی ہے۔اس صورت حال کی اصلاح کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ انسان کی خواہشات میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے اقدامات کئے جائیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس

کی رضا کے حصول کی خواہش کو دوسری تمام خواہشات پر غالب کرنے کے لئے تمام ذرائع ابلاغ وتعلیم کو متحرک کیا جائے کیونکہ انسان کو اِسی مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے ۔فرد اور معاشرے کے درمیان صحتمند توازن قائم کرنے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے دین اتارا اور خواہشات کی حدود وقیود مقرر فرما دیں ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری فطرت اور ہمارے بھلے برے کو خود ہم سے بھی بہتر جانتا ہے اس لئے شریعت کی اصل محبت اور رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی تا کہ وہ اپنی خواہشات کو شرعی حدود کے اندر رکھے اور زمین پر کسی قسم کا فساد نہ پھیلے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

جَاهِدُوْا اَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَائَكُمْ ٥

''اپنی خواہشات کے ساتھ اسی طرح جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرتے ہو''۔

کیونکہ جس طرح باہر کے دشمن ہماری جان کے درپے ہوتے ہیں اسی طرح ہماری خواہشات ایمان کیلئے خطرہ ہیں ۔یہ مال و منال کی کثرت کی ہوس اور نفس کی بے لگام خواہشات ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ خواہشات کے اعتدال اور حقوق و فرائض کے درمیان توازن ہی سے اچھے انسان بنتے اور مثالی تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے دین کو چھوڑ کر سفلی جذبات کی تسکین کیلئے مادر پدر آزادی کی راہ اختیار کرنا تو نفس کی بدترین غلامی کی صورت ہے اور انسان کو حیوانیت کے درجہ سے بھی نیچے گرا دینے اور تہذیب و تمدن کو موت سے ہمکنار کرنے کا طریقہ ہے۔

جو دونی فطرت سے نہیں لائق پرواز
اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد
اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ابلیس انسان کے نفس میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے ۔وہ ازل ہی سے یہ چیلنج کر کے آیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے مشن میں کامیاب نہیں ہونے دیگا۔

اگر انسان اپنی خواہشات کو قرآن میں دیے گئے احکام کا پابند رکھے، نماز اور ذکر میں مداومت کرے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی رضا پر راضی رہے تو اللہ تعالیٰ اسے شیطان کے وسوسوں اور مکروفریب سے محفوظ رکھتا ہے لیکن جونہی وہ اپنے محبوب حقیقی کی محبت اور اس کی اطاعت سے ہٹ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو فوراً شیطان کا تار اس کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اس طرح یہ ازلی دشمن انسان کو مادی آسائشوں، متاعِ دنیا کے لمبے لمبے منصوبوں، اولاد کے مستقبل کے خدشوں اور بے ہنگم آرزوؤں کے جال میں اُلجھا کر اس کی نگاہوں میں دنیا کا متاع اور گناہ کی زندگی کو حسین وجمیل بناتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ مسجودِ ملائکہ پر قابو پالیتا ہے اور آخر اسے اللہ تعالیٰ اور آخرت کی زندگی سے بالکل غافل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شیطانی غلبہ کے اثرات اور اس کے عواقب سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ۝ (المجادلہ۔19)

''شیطان نے ان کو قابو کر لیا اور انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا۔ یہ شیطانی گروہ ہے اور سن رکھو کہ شیطان کا لشکر ہی نقصان اُٹھانے والا ہے''۔

جو لوگ صدق دل سے ایمان لاتے ہیں وہ اپنی ذات اور زندگی کے معاملات کو اپنے رب کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ مال، اولاد، عزت وآبرو اور کامیابی وکامرانی کیلئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وہ تسلیم و رضا کا دامن تھامے ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں اور کبھی بھی غلط راہوں پر نہیں پڑتے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا محبوب ومطلوب سمجھ کر اس کا دائمی ذکر کرنا اور نفس کی خواہشات کو روک کر اللہ کی رضا پر راضی رہنا ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے جس میں شیطان اور اس کے کارندوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اِنَّهٗ لَيۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ۝ اِنَّمَا سُلۡطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَوَلَّوۡنَهٗ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ۝

(النحل99 تا 100)

''شیطان کا ان لوگوں پر کچھ زور نہیں چلتا جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اُس کا زور ان پر چلتا ہے جو اس کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ کے شریک مقرر کرتے ہیں''۔

اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرنا ہی شیطان کے ساتھ دوستی کا مظہر ہے۔ شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے حکم کے مقابلے میں اپنی خواہش کو ترجیح دی اور آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا۔ قرآن کریم (اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ) کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی کو بھی حکمران اور مطاع سمجھنا شرک ہے چاہے وہ اپنا نفس ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہوا و ہوس، طمع و حرص اور دیگر خواہشات نفس کی پیروی کے عواقب سے آگاہ کرتے اور اس سے باز رہنے کی تاکید کرتے ہوئے بار بار فرمایا۔

(1) وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنِ السَّبِيْلِ o (ص۔26)

''اور خواہش کی پیروی نہ کرنا وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی''۔

(2) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ o (محمد۔16)

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چل رہے ہیں''۔

(3) وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (الحشر۔9)

''اور جو شخص حرص نفس سے بچالیا گیا ہے تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں''۔

(4) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ o (البقرہ۔208)

''مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو۔ وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے''۔

(5) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o (الاعراف۔176)

''اگر ہم چاہتے تو ان آیات سے اس کو بلند کر دیتے مگر وہ تو زمین کا ہو کر رہ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی۔ کہ اگر اس پر بوجھ لادو تو زبان نکالے

رہے اور یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ تو آپ ان سے یہ قصہ بیان کردیں تاکہ وہ غور وفکر کریں''۔

آخری آیت میں تو دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ کر نفس کی خواہشات کے پیچھے دوڑنے والوں کو کتے کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے ان کی ظاہری علامات بھی بیان کردی گئی ہیں کہ ان کے چہروں پر کبھی بھی وقار، سکون اور اطمینان کی جھلک نہ دیکھو گے۔ حالات اچھے ہوں یا برے لیکن ہر وقت ان کی سانس پھولی ہوئی اور وہ ہانپتے کانپتے ہی دکھائی دیں گے۔ اپنے نفس کو دنیا کی زینت کی محبت سے بچائے رکھنا ہی تقویٰ کی روح ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی محبت ہی تمام خطاؤں اور گناہوں کی جڑ ہے۔ اس لئے مومن کو آخری دم تک اس محاذ پر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ابلیس دم واپسیں تک انسان کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنے منشور کے مطابق انسان پر آگے سے پیچھے سے دائیں سے بائیں سے حملے کرتا ہے اس لئے مومن کو ان انسانوں سے بھی ہوشیار رہنا چاہئے جو اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں رہتے ہیں کیونکہ ان میں سے جو اسے خلاف حق وصداقت کام کرنے کیلئے اُکساتے ہیں وہ شیطان کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمانے کیلئے کبھی کبھی خود بھی ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں جن میں نافرمانی کی ترغیب زوردار اور گناہ بڑا آسان اور ہلکا محسوس ہوتا ہے تاکہ ہمارے ایمان کا کچا یا پکا ہونا ثابت ہو جائے۔ ایسی آزمائش امارت، فیشن، رُتبہ، لالچ، خوف، سفارش، رشتہ داری، دوستی اور محبت وغیرھم کی صورت میں ہر مومن کے سامنے آسکتی ہے۔ ایسے موقعوں پر مضبوط قوت ارادی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا پختہ یقین ہی ڈگمگانے سے بچا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی ایک بستی جو برلب دریا واقع تھی کا ذکر اسی ضمن میں آیا ہے کہ سبت کے دن جس میں انہیں شکار کرنے کی ممانعت تھی اس دن اللہ کے حکم سے مچھلیاں پانی کے اوپر آ کر انکے سامنے خوب اُچھلتیں لیکن ہفتے کے علاوہ دوسرے دنوں میں نہ آتیں تو ان لوگوں نے لالچ میں آ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی ترکیب نکال لی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''ہم نے خود انکی نافرمانیوں کی عادت کے سبب ان کو آزمائش میں ڈالا'' (اعراف۔163)

اِسی طرح مسلمانوں کیلئے جب احرام کی حالت میں خشکی پر شکار کرنے کی ممانعت کردی گئی تو ساتھ ہی خبردار کرتے ہوئے فرمایا

''اے اہل ایمان! کچھ اس قسم کے شکار سے جن کو تم ہاتھوں اور نیزوں سے باسانی پکڑ سکو اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرے گا تاکہ معلوم کرے کہ اس سے غائبانہ کون ڈرتا ہے۔ تو جو اس کے بعد زیادتی کا مرتکب ہوگا اس کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہوگا''۔ (المائدۃ۔94)

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بندگی کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی اطاعت کسی بھی حالت میں ترک نہ کی جائے۔ جس طرح ایک روزہ دار مومن کسی بھی نفسانی خواہش یا بیرونی سفارش پر اپنا روزہ نہیں توڑتا اسی طرح وہ سمجھتا ہے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اور اس میں بھی میرا روزہ ہے اور میں اللہ کی نافرمانی کر کے اسے ہرگز نہیں توڑوں گا میری جان جاتی ہے تو جائے ایمان نہ جائے۔ کیونکہ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ انسان کو کسی نافرمانی کی حالت ہی میں موت آ جائے۔ اس طرح اگر خدانخواستہ کفر پر خاتمہ ہوگیا تو بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام یعنی اطاعت گذاری کی حالت میں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے ہرگز باہر نہ نکلو ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ o (محمد۔33)

''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو''۔

مومن کیلئے یہ بات نہایت اہم ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے کے اندر رکھے۔ اس دائرے سے باہر نکلنے والی خواہشات ہی وہ دروازہ کھولتی ہیں جس کے ذریعے شیطان انسان کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''لوگو! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہو اور رزق کے حصول میں پسندیدہ اور باوقار طریقے اختیار کرو اس لئے کہ انسان اس وقت تک نہیں مرسکتا جب تک اسے اس کے حصے کا پورا پورا رزق نہ پہنچ جائے اگرچہ اس کے ملنے میں کچھ تاخیر ہی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور روزی کی طلب میں احسن طریقے اپناؤ۔ جو حلال ہو وہ لے لو اور جو حرام ہو اسے چھوڑ دو''۔

حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح (امین الامت)

طالب الہاشمی

(بقیہ حصہ)

دمشق کی شکست نے رومیوں کو سخت مشتعل کر دیا اور وہ اردن کے ایک شہر بسیان میں جمع ہو کر

زبردست جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ مسلمانوں کو اطلاع ملی تو اُنھوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں بسیان کا رُخ کیا اور اس کے سامنے فحل کے مقام پر پڑاوٗ ڈالا۔ لڑائی سے پہلے فریقین کے درمیان سفیروں کے ذریعے گفت وشنید ہوتی رہی لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا بالآخر رومیوں نے اپنا سفیر سردارِ فوج حضرت ابوعبیدہؓ سے براہِ راست گفتگو کیلئے بھیجا۔ رومی سفیر اسلامی لشکر میں پہنچا تو سب سے پہلے مسلمانوں کو ایک ہی رنگ میں ڈوبے پایا۔ اِس نے امیرِ لشکر کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ اس وقت حضرت ابوعبیدہؓ فرش زمین پر بیٹھے تیروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لباس اور عام مجاہدین کے لباس میں مطلق کوئی فرق نہ تھا۔ قاصد نے متحیر ہو کر حضرت ابوعبیدہؓ سے پوچھا، کیا آپ ہی فوج کے سردار ہیں؟ اُنہوں نے کہا، ہاں۔ قاصد نے کہا۔ اگر آپ کی فوج لڑے بھڑے بغیر واپس چلی جائے تو ہم ہر شخص کو دو دو اشرفیاں دیں گے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے قاصد کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر وہ برہم ہو گیا اور دھمکی دے کر واپس چلا گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اسی وقت فوج کو کمر بندی کا حکم دے دیا۔ تیرے دن دونوں فوجوں کے درمیان خونریز لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت ابوعبیدہؓ قلبِ فوج میں تھے اور ایک ایک صف جا کر مسلمانوں کی ہمت بندھاتے تھے۔ پچاس ہزار رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد نصف سے بھی کم تھی لیکن انھوں نے مردانہ وار دشمن پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس طرح فحل اور بسیان مسلمانوں کے زیرِ نگین ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے آگے بڑھ کر مرج الروم پر قبضہ کر لیا اور پھر حمص کا رُخ کیا۔ اہلِ حمص چند ماہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتے رہے لیکن جب انھیں کسی طرف سے کمک کی اُمید نہ رہی تو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ حمص کے بعد حماۃ، شیزر، معرۃ النعمان اور کئی دوسرے مقامات پر بھی یکے بعد دیگرے مسخر ہو گئے۔ اب حضرت ابوعبیدہؓ رومیوں کے ایک مضبوط گڑھ لاذقیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ علامہ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کا محاصرہ لاذقیہ کے دوران میں ایک انوکھی تدبیر سوجھی۔ انہوں نے لاذقیہ کے آس پاس بہت سے پوشیدہ غار کھدوائے اور بظاہر

محاصرہ اُٹھا کر حمص کی طرف کوچ کر دیا۔ اہل لاذقیہ نے مطمئن ہو کر شہر کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ اسی رات کو اپنی فوج کے ساتھ پلٹ کر غاروں پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ انہیں دیکھ کر رومیوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور انہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ لاذقیہ کی تسخیر کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ حمص واپس آ گئے اور رجب ۱۵ھ تک (جس مہینے میں یرموک کی فیصلہ کن جنگ پیش آئی) وہیں مقیم رہے۔

رومیوں کی پے در پے شکستوں نے ہرقل (قیصر روم) کو چونکا دیا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو ہر قیمت پر شام سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے اس نے اپنے تمام مقبوضات آرمینیہ، الجزیرہ، قسطنطنیہ وغیرہ سے فوجیں طلب کیں جو سب انطاکیہ سے روانہ ہوا۔ تو مسلمانوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ شام کے جن جن شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹالی جائیں اور یہ ساری فوجیں سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں ساتھ ہی دربارِ خلافت سے کمک طلب کر لی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق مسلمانوں نے دمشق حمص وغیرہ شہروں کو خالی کیا تو وہاں کے باشندوں کو جزیے کی وہ ساری رقم واپس کر دی جو ان سے وصول کی گئی تھی۔ کیونکہ اب وہ ان شہروں کے باشندوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ پابندی عہد اور رواداری کی ایسی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کا یہی اخلاق تھا جس نے بدترین دشمنوں کے دل بھی موہ لیے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے رومیوں کو جزیہ واپس کیا تو وہ روتے تھے اور دعائیں کرتے تھے کہ خدا تمہیں پھر واپس لائے۔

تمام مسلمان فوجیں شام کے شہروں سے نکل کر دریائے یرموک کے کنارے ایک مقام پر جمع ہو گئیں۔ اسی اثناء میں دارالخلافہ سے کمک بھی آ پہنچی لیکن اب بھی سارے مسلمانوں کی تعداد ملا کر تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی جبکہ رومی لشکر تقریباً دو لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ پہلے دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے۔ رومیوں نے چاہا کہ مسلمان روپیہ لے لیں اور واپس چلے جائیں لیکن مسلمانوں کا مقصد حصولِ زر نہیں تھا اس لئے وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ چنانچہ دونوں فوجوں میں لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ رومی اس معرکے میں نہایت بے جگری سے لڑے۔ انھوں

نے مسلمانوں پر بار بار خوفناک حملے کیے اور ایک دفعہ تو انھیں پیچھے دھکیلنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن مسلمان افسروں کی سرفروشی اور مہارتِ جنگ نے صورتِ حال کو سنبھال لیا اور انہوں نے رومیوں پر اِس غضب کا حملہ کیا کہ ان میں افراتفری مچ گئی۔ اِن کے تقریباً ستر ہزار آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ نکلے۔ یرموک کی اِس عظیم الشان فتح نے شام کی قسمت کا بڑی حد تک فیصلہ کر دیا۔ ہرقل بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور پھر کبھی اس کو شام کی طرف منہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یرموک کی فتح کے بعد مسلمانوں کا سیلِ رواں قنسرین کی طرف بڑھا اور اسے تسخیر کرتے ہوئے حلب اور انطاکیہ تک جا پہنچا۔ ان شہروں پر پرچم اسلام بلند کرنے کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ جس کو حضرت عمروؓ بن العاص نے پہلے ہی محاصرہ میں لے رکھا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس پہنچے تو عیسائیوں نے ہمت ہار دی اور صلح کی درخواست کی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ حضرت عمرؓ خود بیت المقدس آئیں اور اپنے ہاتھوں سے معاہدہ صلح کی تکمیل کریں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ بیت المقدس کی بلا کشت و خون فتح کا انحصار آپ کی یہاں تشریف آوری پر ہے۔ امیر المومنینؓ کو حضرت ابوعبیدہؓ کا خط ملا تو وہ چند مہاجرین و انصار کے ساتھ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ جابیہ کے مقام پر حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ اور دوسرے افسرانِ فوج نے امیر المومنین کا استقبال کیا، وہیں عیسائیوں کے نمائندے بھی پہنچ گئے اور شہر کے اندر داخل ہو کر اس جگہ نماز پڑھی جہاں آج کل مسجد عمرؓ ہے۔ بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت بلال حبشیؓ سے فرمائش کی کہ آج اذان دو، حضرت بلال نے کہا، میں عہد کر چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کبھی اذان نہ دوں گا لیکن آج آپ کا ارشاد بجا لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اذان دینی شروع کی تو صحابہؓ کو رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ یاد آ گیا اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔ حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل روتے روتے بے تاب ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو سارے شام کا والی مقرر کیا۔ اُنہوں نے امیر لشکر اور والی شام دونوں حیثیتوں میں اپنے فرائض مفوضہ نہایت حسن و

خوبی سے انجام دیئے اور لوگوں پر اپنی عسکری اور انتظامی صلاحیتوں کا سکہ بٹھا دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کی ہدایت پر شام کے کئی شہروں میں حلقہ ہائے درس قائم ہوئے جن میں صحابہؓ لوگوں کو قرآنِ حکیم کی تعلیم دیتے تھے اور فقہی مسائل بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ حجاز میں ایسا زبردست قحط پڑا کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اپنے تمام گورنروں سے غلہ طلب کرنا پڑا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو اطلاع ملی تو اُنہوں نے غلے سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ مدینہ منورہ بھجوائے۔ (ایک روایت کے مطابق وہ خود یہ اونٹ لے کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے)

اواخر ۱۷ھ میں رومیوں نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ حمص پر یلغار کر دی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اِدھر اُدھر سے فوجیں جمع کر کے رومیوں کا پرزور مقابلہ کیا اور ایک مختصر لیکن خونریز لڑائی کے بعد انہیں شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ یہ آخری معرکہ تھا جو حضرت ابوعبیدہؓ کو اپنی زندگی میں پیش آیا۔ اس کے بعد رومیوں کو کبھی مسلمانوں کی طرف پیش قدمی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

۱۸ھ ہجری میں شام اور عراق میں طاعون کی خوفناک وبا پھیل گئی۔ تاریخ اسلام میں یہ وبا ''طاعونِ عمواس'' کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں کو اس وبا سے سخت نقصان پہنچا اور ان کے ہزاروں آدمی اس میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اِس وبا کی خبر تو انہیں سخت تشویش پیدا ہوئی اور وہ اس کی تدبیر و انتظام کیلئے خود شام تشریف لے گئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اور فوج کے دوسرے افسروں نے سرغ کے مقام پر امیر المومنین سے ملاقات کی۔ حضرت عمرؓ نے اِن اصحاب سے مشورہ کیا تو اکثر کی رائے یہ تھی کہ مقام (عمواس) سے ہٹ جانا چاہیے لیکن حضرت ابوعبیدہؓ کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے منادی کرائی کہ کل ساری فوج میرے ساتھ یہاں سے کوچ کرے گی تو حضرت ابوعبیدہؓ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

''اے عمرؓ کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟''

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

''ابوعبیدہؓ کاش یہ بات تمہارے سوا کسی اور کے منہ سے نکلی ہوتی، میں تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی ہی کی طرف بھاگتا ہوں۔ تم خود ہی بتاؤ کہ اگر کچھ اونٹوں کے ساتھ تمہارا گزر کسی ایسی وادی سے ہو جس کے دو کنارے ہوں ایک بنجر اور ویران۔ دوسرا سرسبز و شاداب۔ تو کیا سرسبز و شاداب حصے میں اونٹوں کو چرانا تقدیر الٰہی کے موافق نہ ہوگا؟''۔

بایں ہمہ حضرت ابوعبیدہؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ واپس جا کر حضرت ابوعبیدہؓ کو خط لکھا جس میں ان کو مدینہ منورہ آنے کیلئے کہا گیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ سمجھ گئے کہ امیر المومنین انہیں وبا زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں لکھ بھیجا:

''امیر المومنین آپ مجھے جس غرض کے لئے مدینہ بلانا چاہتے ہیں میں اسے سمجھ گیا۔ میں مسلمانوں کی فوج میں ہوں اور میرا دل ان سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا اس لئے مجھے یہیں رہنے دیں''

حضرت عمرؓ یہ خط پڑھ کر بے اختیار رو پڑے اور حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک اور خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ اس وقت فوج جس مقام پر ہے وہ مرطوب اور نیچا ہے اس لیے لشکر کو لیکر کسی اونچی جگہ منتقل ہو جایئے۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے اس حکم کی تعمیل کی اور فوج کو لے کر جابیہ منتقل ہو گئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ان پر بیماری کا حملہ ہو گیا۔ جب مرض نے شدت اختیار کی تو اُنہوں نے معاذؓ بن جبل انصاری کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور لوگوں کو اللہ کی اطاعت اور اتحاد و اتفاق کی وصیت کرتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھاون برس کی تھی۔ حضرت معاذؓ بن جبل نے تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور مسلمانوں کے سامنے نہایت پر درد خطبہ دیا جس میں فرمایا!

''مسلمانو! تم پر آج ایک ایسے شخص کی جدائی کی مصیبت آ پڑی ہے جس کی مثل میں نے خدا کے بندوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ سب سے بڑھ کر درگزر کرنے والے تھے۔ سب سے زیادہ غل و غش سے پاک تھے۔ مسلمانوں کے سب سے زیادہ خیر اندیش تھے اور ان پر سب سے بڑھ کر شفیق تھے اس لئے تم سب ان کے واسطے رحمت اور مغفرت کی دُعا کرو۔ خدا کی قسم اب ان

جیسا کوئی شخص تمہارا سردار نہ ہوگا''۔

اس کے بعد حضرت معاذ نے نمازِ جنازہ پڑھائی،حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت ضحاکؓ بن قیس قبر میں اُترے اور اسلام کی اِس آفتاب جہانتاب کو سپردِ خاک کردیا۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی جائے مدفن کے بارے میں اختلاف ہے۔حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں ایک جگہ ان کی قبر فحل میں بتائی ہے اور ایک دوسرے مقام پر ان کا مدفن بیسان میں بتایا ہے۔ ابن اثیرؒ نے ''اُسدالغابہ'' میں ان کی جائے تدفین ''عمواس'' بتائی ہے جو رملہ سے بیت المقدس کی جانب چار فرسخ کی مسافت پر واقع ہے لیکن انہوں نے ''بیسان'' والی روایت کو بھی رد نہیں کیا۔حضرت ابوعبیدہؓ کی خانگی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ایک روایت کے مطابق انہوں نے صرف ایک نکاح کیا تھا، اہلیہ کا نام ہندؓ بنت جابر تھا ان سے دو لڑکے یزید اور عمیر پیدا ہوئے لیکن دونوں لاولد فوت ہوئے۔

ایک اور روایت میں ان کی دو بیویوں کا بھی ذکر آیا ہے لیکن ان کی نسل آگے نہ چلنے پر سب کا اتفاق ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ سے مروی چند احادیث بھی کتابوں میں ملتی ہیں۔ان کے راویوں میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ اور حضرت سمرہؓ بن جندب جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔

فضائل ومحاسن اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے حضرت ابوعبیدہؓ نہایت ارفع واعلیٰ مقام پر فائز تھے۔سبقت فی الاسلام، راہِ حق میں بلاکشی،حبِ رسول،شوقِ جہاد، جوانمردی، زہد واستغفار، اخلاق وایثار، حلم وشفقت اور تدبیر فراست ان کی کتابِ سیرت کے سب سے درخشاں ابواب ہیں۔ان کے یہی اوصاف ومحاسن تھے جن کی بدولت انہیں بارگاہِ رسالت میں درجۂ تقرب حاصل ہوگیا تھا۔انہوں نے نہ صرف عہدِ رسالت کا ہر شرف حاصل کیا بلکہ ''امین الامت'' کے منفرد لقب سے بھی مشرف ہوئے۔ان کا وجودِ مبارک ایسے عظیم الشان مناقب اور اخلاقِ فاضلہ کا مظہر تھا کہ تمام صحابہ کرامؓ ان کی دل سے تعظیم وتکریم کرتے تھے۔جب وہ مجاہدین کو لے کر شام کیلئے روانہ

ہونے لگے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرب کے مشہور شہسوار حضرت قیس بن مکشوح کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''میں تم کو ابوعبیدہؓ الامین کی قیادت میں بھیج رہا ہوں جو ایسے آدمی ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی بھی کرتا ہے تو وہ اسے برداشت کر لیتے ہیں۔ جو ان کے ساتھ برائی کرتا ہے اس کو معاف کر دیتے ہیں جو ان سے تعلق توڑتا ہے وہ اس سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر نہایت شفیق ہیں اور کافروں پر بہت سخت اس لئے تم لوگ کسی معاملے میں ان کی نافرمانی یا مخالفت نہ کرنا، وہ تمہیں جو حکم دیں گے تمہاری بھلائی کیلئے دیں گے''۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت معاذ بن جبل کی خدمت میں چار سو دینار اور چار ہزار درہم بھیجے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے حصے کی تمام رقم فوج میں تقسیم کر دی اور حضرت معاذؓ نے بھی چند درہم و دینار کے سوا جو انہوں نے اپنی اہلیہ کے کہنے پر گھریلو ضروریات کیلئے رکھ لیے تھے، تمام رقم مستحقین میں تقسیم کر دی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو معلوم ہوا تو بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:۔

''الحمدللہ کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی نظروں میں سیم و زر کی کچھ حقیقت نہیں''۔

حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک حضرت ابوعبیدہؓ کی بے انتہا قدر و منزلت تھی اور وہ انہیں اپنا بھائی کہا کرتے تھے۔ امیر المومنین ۱۷ھ ہجری میں بیت المقدس تشریف لے گئے تو ان کے استقبال کیلئے سردارانِ فوج کا سیلاب اُمڈ آیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان میں حضرت ابوعبیدہؓ کو نہ پایا تو پوچھا، ایـن اخـی؟ میرے بھائی کہاں ہیں؟ لوگوں نے پوچھا امیر المومنین آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ فرمایا، ابوعبیدہؓ کے بارے میں۔ اتنے میں حضرت ابوعبیدہؓ اپنی اونٹنی پر سوار آ پہنچے۔ دوسرے اصحاب میں سے اکثر نے فتوحات کے بعد اپنا معیارِ زندگی قدرے بدل لیا تھا۔ لیکن حضرت ابوعبیدہؓ کے زیب بدن وہی سادہ اور معمولی لباس تھا جس میں حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ منورہ سے چلتے وقت دیکھا تھا۔ میرے بھائی میرے بھائی کہتے ہوئے ان سے بغل

گیر ہو گئے۔ پھر مزاج پرسی کیلئے ان کی جائے قیام پر تشریف لے گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تلوار ڈھال اور اونٹ کے کجاوے کے سوا وہاں کسی قسم کا سامانِ آسائش نہیں تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور انہوں نے فرمایا: ''ابوعبیدہؓ سامان تو گھر میں رکھ لیتے''۔ انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا: ''امیر المومنین ایک مجاہد کیلئے یہی سامان کافی ہے''۔

بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے ازراہِ خوش طبعی و بے تکلفی کہا۔ ''بھئی اور لوگ تو میری دعوت دے چکے ہیں لیکن تم نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ آج تم بھی میری دعوت کر دو نا!''

حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کیا: ''امیر المومنین میں اس خیال سے خاموش تھا کہ شاید آپ کو میری دعوت پسند نہ آئے ورنہ میں اپنے غریب خانہ پر ہر وقت آپ کیلئے چشم براہ ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ ان کی جائے قیام پر تشریف لے گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے امیر المومنین کے سامنے لا کر رکھ دیئے اور عرض کی:

''امیر المومنین میری تو یہی خوراک ہے۔ دونوں وقت روٹی کے یہ سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیتا ہوں''۔

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ رونے لگے اور فرمایا ''شام میں آکر سب ہی بدل گئے لیکن ابوعبیدہ ایک تم ہو کہ اپنی اُسی وضع پر قائم ہو''۔

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''کسی کے منہ پر تعریف کرنا ممدوح کی گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے لیکن اے ابوعبیدہؓ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہارے سوا ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بدل لیا ہے''۔

حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی وفات سے پہلے صحابہ کرامؓ نے جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا تو اُنھوں نے فرمایا کاش! ابوعبیدہؓ زندہ ہوتے تو خلافت کیلئے میں ان کا نام تجویز کرتا، قیامت کے

دن مجھ سے ان کے بارے میں سوال ہوتا تو میں عرض کرتا، الٰہی میں نے تیرے نبیؐ کو اس شخص کے بارے میں یہ فرماتے سنا تھا کہ ''یہ (ابوعبیدہؓ) اِس اُمت کا امین ہے''۔

صحیح مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک حضرت ابوعبیدہؓ کا یہ مرتبہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کو مکروہ سمجھتے تھے۔

مسندِ احمد ابن حنبلؒ میں حضرت ابوعبیدہؓ کی عبرت پذیری کے سلسلے میں ایک روایت ہے کہ ان دن رو رہے تھے کسی شخص نے پوچھا کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ کہنے لگے، اِس لئے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فتوحاتِ شام وغیرہ اور مسلمانوں کے تمول کا تذکرہ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ ابوعبیدہؓ اگر تم وہ زمانہ پاؤ تو صرف تین خادم رکھنا۔ ایک اپنی خدمت کیلئے۔ ایک اہل وعیال کی نگہداشت کیلئے اور ایک سفر میں ساتھ لے جانے کیلئے۔ اِسی طرح سواری کیلئے تین جانور کافی ہوں گے ایک سامان کیلئے، ایک تمہارے لئے اور ایک غلام کیلئے۔ لیکن آج میں دیکھ رہا ہوں کہ گھر میں غلام ہی غلام ہیں اور اصطبل جانوروں اور گھوڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ آہ میں رسول اللہؐ سے کس طرح ملوں گا؟ آپؐ نے وصیت فرمائی تھی کہ تم میں سے وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہوگا جو مجھے اس حال میں ملے جس حال میں اِسے چھوڑ جاؤں گا۔

مولانا سعید انصاری نے ''سیر الصحابہؓ'' میں لکھا ہے کہ ''مسند'' کی یہ روایت سند کے لحاظ سے قابل اطمینان نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کے زُہدو استغنا نے کبھی انہیں اپنا گھر غلاموں اور اونٹ گھوڑوں سے بھرنے کی اجازت دی ہو۔

شام کا ہمہ مقتدر والی اور سپہ سالار اعظم ہونے کے باوجود حضرت ابوعبیدہؓ کے انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ نہ کبھی امتیازی لباس پہنا اور نہ کبھی اونچی جگہ کو نشست گاہ بنایا۔ معمولی لباس میں سپاہیوں کے درمیان فرشِ خاک پر بیٹھ جاتے تھے۔ رومیوں کے سفیر آتے تھے تو دریافت کے بغیر وہ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ مسلمانوں کا امیر کون ہے۔ غرض انہوں نے انکسار اور مساوات کی حیرت انگیز مثال قائم کر دی تھی۔

ایک مرتبہ ایک مسلمان سپاہی نے دشمن کے ایک سپاہی کو پناہ دے دی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص نے اس کو ماننے میں عذر کیا کہ یہ پناہ ایک سپاہی نے دی ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے فرمایا، میں اس مسلمان مجاہد کی دی گئی پناہ کو رد نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرد سب کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے۔

اس انکسار اور تواضع کے باوجود وہ نصیحت و تلقین اور حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مسند خلافت پر بیٹھنے کی اطلاع ملی تو انہیں شام سے ایک پر اثر خط لکھا جس میں انھیں روزِ آخرت کا خوف دلایا اور عدل و انصاف کی تلقین کی۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کی زندگی ایک نمونہ کی زندگی تھی، اِس کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ مطلعِ انوار نظر آتا ہے اور اُمتِ مسلمہ کو اپنی منزل مقصود متعین کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

خدا کی محبت

مولوی عبدالحیٔ صاحب صدیقی (علیگ)

خدا کی محبت ہی حقیقی محبت ہے اور انسان کیلئے اعلیٰ ترین نعمت جس کو بھی عطا ہو جائے۔

''بہت سے روحانی خطرات ایسے ہیں جوانسان کے دل میں خدا کی محبت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ دل میں اُس محبت کے پیدا ہونے کے واسطے انسان میں بہت سے اوصاف حمیدہ کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ تکمیل انسانیت کا انحصار اِسی پر ہے کہ انسان کے دِل میں خدا کی محبت پورے طور پر غالب اور مسلط ہو۔ اور اگر دل میں یہ محبت پورے طور پر قابض اور مسلط ہو۔ اور اگر دل میں یہ محبت پورے طور پر قابض نہیں تو بھی اس کو تمام دوسری چیزوں کی محبت پر فائق اور حاوی ہونا چاہئے۔

خدا کی محبت کو کماحقہ سمجھنا نہایت دشوار امر ہے۔ فقہا کی ایک جماعت تو قطعی اس کی منکر ہے کہ انسان ایک ایسی ہستی سے بھی محبت کرسکتا ہے جو خود اس کی جنس نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت کے معنی صرف خدا کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے۔ جن لوگوں کے یہ خیالات ہیں اُن کو نہیں معلوم کہ حقیقی مذہب کیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے یہ دُعا اپنے اصحاب کو تلقین فرمائی تھی ''اے خدا تو مجھے اپنی محبت عطا فرما اور اُن کی محبت جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور وہ چیز مرحمت فرما جو مجھے تیری محبت سے قریب کر دے اور اپنی محبت کو میرے دِل میں ایک پیاسے کی ٹھنڈے پانی کی خواہش سے زیادہ گرانقدر کر''۔ حسن بصری کہا کرتے تھے۔ ''وہ شخص جو خدا کو پہچانتا ہے اُس سے محبت کرتا ہے اور وہ شخص جو دنیا کو جانتا ہے۔ اُس سے (دنیا) نفرت کرتا ہے''۔

اب ہم محبت کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ محبت کے معنے طبیعت کے کسی خوشگوار چیز کی طرف مائل ہو جانے کے ہیں۔ حواس خمسہ کے باب میں یہ بات بالکل واضح ہے۔ اِن میں سے ہر ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر حاسہ اُس چیز سے محبت کرتا ہے۔ جو اُس کیلئے باعث مسرت ہو جس طرح کہ آنکھ خوش منظر چیزیں پسند کرتی ہے اور کان کو موسیقی اچھی معلوم ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اِس قسم کی محبت ہے۔ جس میں حیوان بھی ہمارے شریک ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ دِل میں ایک اور بھی حاسہ ہے۔ قوت بصیرت، جو حیوانات میں نہیں ہوتی۔ اِس کے ذریعہ سے ہم روحانی خوبیوں اور اوصاف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن جس کی چشم بصیرت خدا کے اوصاف و کمالات

کے مشاہدہ کیلئے کھلی ہوئی ہے تو وہ دنیاوی مناظر کو چاہے وہ کتنے ہی دل آویز کیوں نہ ہوں۔ مقابلۃً حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اول الذکر قسم کے آدمی تو یہی خیال کرتے ہیں کہ خوبصورتی محض سرخ وسفید صورتوں اور اعضاء کے اچھے تناسب اور ایسی ہی دوسری چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اخلاقی اور روحانی خوبیوں کے دیکھنے کیلئے اندھے ہیں۔ جس کے متعلق اکثر لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ فلاں شخص ایسی ایسی خوبیوں کا آدمی ہے۔ لیکن وہ شخص جس کے پاس چشم بصیرت ہے وہ اپنے بزرگانِ سلف سے بھی محض اُن کے اوصاف حمیدہ کے سبب محبت کر سکتا ہے۔ اِس قسم کی محبت کسی ظاہری صورت یا جسم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ باطنی خوبیوں پر منحصر ہے۔ جس طرح جب ہم کسی بچہ کے دل میں کسی شخص کی محبت پیدا کرانا چاہتے ہیں تو اُس شخص کی جسمانی خوبصورتیوں کا بیان نہیں کرتے بلکہ اُس کے باطنی اوصاف کا ذکر کرتے ہیں۔

جب ہم اِس نظریہ کو خدا کی محبت پر منطبق کرتے ہیں تو ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ صرف اُسی کی ذات ایسی ہے جو حقیقتاً ہماری محبت کے لائق ہے اور اگر کوئی شخص اُس سے محبت نہ کرے تو اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کو پہچانتا نہیں۔ ہم کسی شخص میں جس چیز سے بھی محبت کرتے ہیں۔ تو اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ خدا کا پرتو ہے۔ یہ بات ہم پر اور اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ اگر ہم اُن اسباب پر غور کریں جن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

پہلا سبب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اُس چیز سے جو اُس کی ہستی کو با کمال کردے اور یہ اپنی محبت خدا کی محبت کیلئے ذریعہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ انسان کا وجود اور اُس کی تکمیل سوائے عطیہ خداوندی کے اور کچھ نہیں اور یہ خدا کی انتہائی مہربانی تھی۔ کہ انسان کتم عدم سے عالم شہود میں آیا۔ اور اُس کی بقا اور ذرائع اکتساب کمال بھی خدا ہی کی مہربانی پر منحصر ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہو گی۔ کہ اگر کوئی آدمی آفتاب کی تمازت سے کسی درخت کے سایہ میں پناہ گزیں ہو۔ اور درخت کا احسان مند نہ ہو کر جس کے بغیر سایہ کا وجود ہی نہ ہوتا بجنسہٖ اِسی طرح اگر خدا نہ چاہتا تو انسان ہوتا اور نہ اُس کے یہ تمام اوصاف۔ تو پھر وہ خدا کو پہچانتے ہوئے اس سے کیونکر محبت نہ کرے، دراصل جاہل خدا سے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُس کی محبت صرف اُس

کے جاننے ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جاہل کو علم کہاں؟

دوسرا سبب اِس محبت کا یہ ہے کہ انسان اپنے محسن سے محبت کرتا ہے اور در اصل اُس کا حقیقی محسن خدا ہے۔ کیونکہ اُس کے ہم جنس اُس کے ساتھ جو کچھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وہ سب تائید خداوندی ہے۔ وہ کوئی بھی جذبہ ہو جو انسان کے دل کو دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنے پر آمادہ کرے۔ خواہ مذہبی خیال سے تحصیل ثواب یا طلب جاہ یا خواہش نام نیک کچھ بھی ہو اس جذبہ کا محرک صرف خدا ہی ہوتا ہے۔

تیسرا سبب اِس محبت کا یہ ہے کہ محبت پیدا ہوتی ہے خدا کے اوصاف پر غور و تفکر سے اس کی قوت و دانائی کے سمجھنے کی کوشش سے جس کی ایک ہلکی سی جھلک انسان میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ محبت نہایت بے لوث ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا۔ ''وہ بندہ مجھ کو نہایت محبوب ہے۔ جو مجھ کو کسی سزا کے خوف سے یا انعامات کی توقع پر تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ محض اُس فرض کے ادا کرنے کیلئے میرا طالب ہوتا ہے۔ جو میری الوہیت کا مقتضا ہے۔

چوتھا سبب اِس محبت کا انسان اور خدا کے درمیان تعلق ہے۔ جس کا اشارہ رسول اکرمﷺ کے اُس قول میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ہی شباہت پر خلق کیا ہے۔ مزید برآں خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ کہ میرا بندہ مجھ سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے تا کہ میں اُس کو اپنا دوست بنالوں اور جب میں اس کو اپنا دوست بنالیتا ہوں تو پھر میں اس کے کان، اِس کی آنکھ، اِس کی زبان بن جاتا ہوں۔ (مرسلہ! ماجد محمود توحیدی)

ہمیں خدا کیونکر ملا؟

برہ اسلام (نیو برٹن۔۔۔امریکہ)

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کے فضل و کرم سے میں نے عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا ہے۔۔۔میں نے یقیناً بہت بڑا فیصلہ کیا ہے اور مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ میرے عیسائی دوست اور عزیز اس کا ادراک نہیں کر سکیں گے کہ میں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا انکار کیوں کیا ہے؟ کاش وہ احساس کر لیں کہ عقیدۂ توحید تک پہنچنے کیلئے میں نے کس قدر مطالعہ کیا ہے اور کتنے لمبے عرصے تک غور و فکر سے کام لیا ہے۔

دراصل عیسائیت نے نظریاتی اور عملی اعتبار سے کبھی بھی مجھے مطمئن نہ کیا۔ آبائی طور پر میرا تعلق کیتھولک مسلک سے تھا اور شعور مند ہونے پر مجھے اس مسلک کی کمزوریوں کا احساس ہونے لگا تھا، لیکن ان کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی اور چرچ کے ذمہ دار حضرات گھور کر اور ڈانٹ کر خاموش رہنے کی تاکید کرتے تھے۔ مثال کے طور پر تثلیث کا عقیدہ میری عقل سے بالکل ماورا تھا جسے مضحکہ خیز دلیل کے ذریعے قابل فہم بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یعنی ۱+۱+۱=۳۔

اِسی طرح عیسوی طریق عبادت نے بھی مجھے کبھی متاثر نہ کیا۔ میرے سکول ٹیچرز نے اصرار کے ساتھ ترغیب دی کہ میں عیسائی روایت پسندوں (CULTISTS) سے وابستہ ہو جاؤں، لیکن میرے ذوق اور وجدان نے اس طرزِ عبادت کو پسند نہ کیا کہ بے ہنگم شور، مصنوعی قسم کی خوشکن اور جذباتی نوعیت کی شاعری جس کا جزو لازم تھا۔ میں جب ان لوگوں کو بے قابو ہو کر گاتے ہوئے سنتی اور قیمتی گٹاروں پر انگلیاں چلاتے ہوئے کبھی یہ آنسو بھی بہانے لگتے تو مجھے اچھے نہ لگتے۔۔۔

کیتھولک فرقے کے لوگ میرے اس سوال کا جواب نہ دے سکے کہ جب پروٹسٹنٹ بھی تین خداؤں کے پرستار ہیں تو میں ان کے ساتھ مل کر عبادت کیوں نہ کروں؟

جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے ہائی سکول کے زمانے ہی میں کیفیت یہ تھی کہ سارے ماحول کے تحت میں بھی بے کنار آزادی کی زبردست خواہش مند تھی اور اس سلسلے میں اخلاقی قیود کی قائل نہ تھی۔۔۔لیکن روحانی اعتبار سے تشنگی اور خلا کا احساس مسلسل مضطرب رکھتا تھا۔ اِسی لیے صداقت اور حقیقت کی تلاش کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ چنانچہ میں گریجوایشن کے مراحل میں تھی جب میں نے پہلی بار عیسائیت سے باہر نکل کر دیگر مذاہب کے مطالعے کا آغاز کیا۔

میں نے سب سے پہلے ہندو مت کا مطالعہ کیا اور پھر بدھ مذہب کا۔۔۔لیکن دونوں نے مجھے ذرا بھی متاثر نہ کیا۔۔۔دونوں میں شرک و بت پرستی اور توہم کا کم و بیش وہی انداز پایا جو

عیسائیت میں کارفرما تھا۔

اخیر میں میں نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اس نے مجھے واقعی بے پناہ متاثر کیا۔ مطالعہ و تحقیق کے دوران اس امر کا انکشاف ہوا کہ میرا ضمیر دراصل ایک ایسے مذہب کی تلاش میں تھا جس میں توحید اور خالق کائنات کی وحدانیت کارفرما ہوتی اور اسلام کی صورت میں مجھے وہ گوہر گم گشتہ آخر کار مل گیا۔

اسلام کی یہ ادا مجھے بڑی پسند آئی کہ اس نے نہایت دوٹوک انداز میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ کا اعلان کیا جب کہ عیسائیت، ہندومت اور بدھ مت میں یہ بنیادی نظریہ ابہام کے دبیز پردوں میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ کتنا بے میل، صاف اور نکھرا ہوا ہے یہ عقیدہ کہ ''اللہ کے سوا ہرگز کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' اور یہی عقیدہ عقل کو اپیل کرتا ہے۔

اس کے برعکس پوری کوشش اور جستجو کے باوجود میں عیسائیت میں توحید کا عقیدہ تلاش کرنے میں ناکام رہی۔۔۔ لیکن وہ جو مسیح نے فرمایا کہ ''دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے، کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے''۔ (متی باب ۷ آیت ۷،۸) میں نے جی جان سے حق کی تلاش کی اور حق مجھے مل گیا۔۔۔ ورنہ بائبل کا تو یہ حال ہے کہ اس کے مختلف نسخوں کے متن ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابہام اور استعاراتی اسلوب بیان بار بار حقیقت کا راستہ روک لیتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ میتھوڈسٹ (METHODISTS) یہوا (JEHOVAS) کی بائبل نہیں پڑھتے اور یہوواہ والے اینگلیکن (ANGLICANS) کی بائبل کو مردود قرار دیتے ہیں اور BAPTIST عیسائی DUAY کی انجیل کو ناپسند کرتے ہیں۔۔۔ یعنی ایک ہی مذہب کے لوگ ایک مذہبی کتاب نہیں رکھتے۔ ہر فرقے کی الگ کتاب ہے جو دوسرے کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے۔

اس کے برعکس اگر تحقیق کریں تو حضرت مسیحؑ بھی توحید خالص کے پرچارک تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کے اعتبار سے کونسی بات اولیت رکھتی ہے تو آپ نے جواب دیا ''اے اسرائیل (یعنی بندہ خدا) سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے''۔ (مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹) توحید خداوندی کا واضح اشارہ انجیل یوحنا (۱۷:۳) اور متی (۱۹:۱۷) میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

چنانچہ میرے ذہن میں ذرا بھی شبہ نہ رہا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد ﷺ دونوں ایک ہی خدائے قدوس کے بندے اور پیغمبر ہیں اور دونوں کی تعلیمات میں کہیں کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ اور یہ عقیدہ تو بالکل ہی خلاف عقل اور لایعنی ہے کہ یسوع مسیح خود خدا ہیں۔۔۔ اگر ایسا ہے تو

عیسائیوں ہی کے عقیدے کے مطابق انہیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ پھر ایسے خدا کے بارے میں کیا تبصرہ کیا جائے جسے دشمنوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس کے برعکس قرآن جگہ جگہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ اللہ کے بندے اور پیغمبر تھے۔

بہر حال مجھے اسلام کی جس تعلیم نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ عقیدہ توحید ہے۔ کتنی وضاحت ہے اِس مختصر سورت میں **قل هو الله احد ٥ الله الصمد ٥ لم يلد ولم يولد ٥ ولم يكن له كفوا احد ٥** یعنی اے پیغمبر اعلان کر دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔ وہ بڑا ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔

اسلام زندگی گزارنے کا ایک مکمل، بھرپور ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے۔ اسے اللہ جل شانہٗ نے خود عطا فرمایا ہے اور اپنے آخری پیغمبر کے ذریعے مرتب و منظم صورت میں بنی نوعِ انسان کی راہنمائی کیلئے مرحمت فرما دیا۔ چنانچہ اسلام آج ایک ایسا زندہ معجزہ اور جیتا جاگتا انقلاب ہے جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی بہترین بھلائیاں عطا کرتا ہے۔

جہاں تک میں نے سمجھا ہے مومن وہ ہے جو مکمل طور پر اپنے آپ کو اللہ تعالٰی کی اطاعت میں دے دیتا ہے اور اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی یاد میں گزرتا ہے۔ کاش عیسائی اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ حضرت مسیحؑ بھی مکمل مسلمان تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کیلئے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے ہی یہ پیش گوئی فرمائی تھی کہ جناب موسیٰؑ کی طرح ایک پیغمبر مبعوث ہوں گے جو حق و صداقت کی روح (SIPRIT OF TRUTH) ہوں گے اور یہ پیش گوئی حضرت محمد ﷺ ہی پر منطبق ہوتی ہے۔

اس طرح جب میں نے اسلام کو دریافت کیا تو دراصل حضرت مسیحؑ کی صحیح تعلیمات کو پالیا۔ ابہام سے یقین تک پہنچ گئی اور اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آ گئی۔

علامہ اقبالؒ۔ پیدائش، بچپن، جوانی

''سرگزشت اقبال'' سے اقتباسات (بقیہ حصہ)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

کالج کے زمانے میں بھی ایک طرف میر حسن شاہ سے مسلسل رابطے اور دوسری اپنے صوفی منش والد ماجد کے زیر اثر اقبال کو دین سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اِس سلسلے میں ایک پُر تاثیر واقعہ خود اقبال کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

''میں نے کہا تھا قرآن مجید دل کے راستے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا میرا معمول تھا۔ ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھتے ہو؟ مجھے ان کے سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مودبانہ عرض کیا ،قرآن پاک۔ کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اُنہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا، آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے؟ کچھ دن گزرے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول تلاوت قرآن پاک کر رہا تھا، والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو اُنہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے، بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے، کہنے لگے! تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کس پر نازل نہیں ہوگا؟ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو، جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے، ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں گا جیسے ان کا ارشاد ہے کہ انہوں نے کہا، سنو اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج تک پہنچانے کا تھا، اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالت مآب ﷺ تک، کہ خاتم

الانبیاء ہیں، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمد یہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذات محمد یہ کی تشکیل پر ہوا۔

''والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اِس ارشاد کی تشریح کی۔ اُنہوں نے کہا شعور انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے، تو ذات محمد یہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔ حضور رسالت مآب تشریف لائے۔ باب نبوت بند ہوا۔ انسانیت اپنے معراج مکمل کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ حسنہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے محبت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا، اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اِس کہنے کا کہ قرآن مجید اِس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو''۔

اِس وقت اقبال کا سن سولہ سترہ برس کا ہو گا لیکن یہ لاجواب نکتہ ان کے دل میں تر ازو ہو گیا اور کیا شاعری اور کیا نثر نگاری اور کیا خطابت۔۔۔کبھی میں آخری دم تک جاری و ساری رہا۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

باقاعدہ شاعری کا آغاز کب ہوا؟ خان بہادر مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی۔ لیکن سر عبدالقادر کا بیان ہے کہ ''ابھی سکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اِس کیلئے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اُردو میں ان دنوں نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کیلئے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کیلئے بھی ایسے اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کو خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اِس ابتدائی غزل گوئی میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا

سمجھا جاتا تھا۔ گو اِس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں اقبال نے شہرت پائی مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں ۔انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا، البتہ اِس کی یاد دونوں طرف رہ گئی ۔داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایا رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کرلیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جس کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی ۔مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

اقبال دین سے بے پناہ محبت، علم وادب سے گہری دلچسپی، درسی کتب کے مطالعہ میں انہاک اور شعروشاعری میں درک سے یہ تاثر لینا مناسب نہیں ہوگا کہ اقبال پر بچپن اور عنفوان شباب کے زمانوں میں ایک گمبھیر سنجیدگی طاری تھی اور وہ تفریحات سے نفور تھے، یا ان میں شوخی موجود نہیں تھی ۔اِس زمانے میں پرندے پالنے اور ان سے کھیلنے کا مشغلہ عام تھا اور اقبال نے بھی اس میں دلچسپی لی اور وہ بھی مولانا میر حسن شاہ کے صاحبزادے سید محمد تقی کی رفاقت میں ۔بلکہ یہ روایت بھی عام ہے کہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے ۔آپ نے فرمایا: کم بخت، اِس میں تمہیں کیا مزا ملتا ہے، تو اقبال نے اِسی وقت جواب دیا حضرت! ذرا اِسے پکڑ کر دیکھئے ۔ایک مصنف نے اسے سراسر زیادتی اور بے انصافی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ بے حد اطاعت گزار شاگرد ایسی ''گستاخانہ دیدہ دلیری'' کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے راوی خود حضرت علامہ اقبال تھے ۔اور اتنی بات کا تو راقم الحروف بھی چشم دید گواہ ہے کہ حضرت علامہ نے میاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں لاہور کے اہل علم سے خوش گپیوں کے دوران میں بٹیر بازی کے فن پر گفتگو فرمائی اور ہاتھ سے بٹیر کو ''مٹھیانے'' کا طریقہ بتایا۔رہی اُستاد کے سامنے شاگرد کی ''جسارت'' اتنی ہی قابل اعتراض ہے تو اِس واقعہ کو کیوں خوشی سے بیان کر دیا جاتا ہے کہ اُستاد نے سکول میں دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اقبال بولے! کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے ۔اس میں کوئی شبہ نہیں نہ یہ ذومعنی بات ہے، لیکن ہے تو ''جسارت''۔

علامہ کا اصل تفریحی مشغلہ کبوتر بازی تھا۔ جس مصنف کو بٹیر بازی کے ''الزام'' پر اعتراض تھا، وہی فرماتے ہیں کہ اقبال کو ''لڑکپن سے لے کر بڑے ہونے تک کبوتر پالنے کا شوق رہا''۔ خاندان اقبال کے ایک فرد بزرگوں کی روایت سے بتاتے ہیں کہ جب شیخ نور محمد نے اقبال کا شوق دیکھا تو انہیں گھر پر ہی کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی تا کہ وہ کبوتروں کے شوق میں غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں۔ اقبال گھر کی چھت سے اپنے کبوتر اُڑاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے ان کی پرواز سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ کبوتروں کا شوق انہیں کافی عرصے تک رہا۔ لاہور میں انارکلی میں بھی ان کے پاس کبوتر تھے، جب میکلوڈ روڈ پر منتقل ہوئے تو کبوتروں کیلئے خاص ڈربے بنوائے، لیکن جب جاوید اقبال پیدا ہوئے تو انہوں نے یہ شوق ختم کر دیا اور تمام کبوتر گھر سے نکال دیے تا کہ جاوید اِس شغل سے محفوظ رہیں۔ سید نذیر نیازی نے اس شوق کا تذکرہ کرتے ہوئے جو دلچسپ واقعہ بیان کیا اور جو گہرا نکتہ پیدا کیا وہ اس قابل ہے کہ پیش خدمت ہو جائے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''حضرت علامہ کو کبوتروں سے بڑی دلچسپی تھی، بلکہ ایک زمانے میں انہوں خوب خوب کبوتر پال رکھے تھے۔ یہ شوق انہیں بچپن ہی سے تھا جس میں راقم الحروف کے برادر عم زاد سید محمد تقی مرحوم بھی ان کے شریک تھے۔ اِس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف جب قیام دہلی میں پہلی مرتبہ مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بسلسلہ تعارف حضرت علامہ سے میرے تعلق کا ذکر کیا گیا تو کہنے لگے، میں ان کے علم و فضل کا قائل ہوں۔ لیکن یہ خودی کیا چیز ہے؟ میں خودی کو نہیں سمجھا۔ تم سمجھاؤ خودی کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں۔ یوں بھی جب بہ ایں علم و فضل آپ نہیں سمجھے کہ خودی کیا ہے تو مجھ جیسا کم علم انسان اسے کیا سمجھے گا؟ اس پر مولانا مسکرا کر کہنے لگے، اقبال نے جب اسرار خودی لکھی تو اس کا ایک نسخہ ہمیں بھیجا تو ہم نے اِس کی بڑی تعریف کی اور ہم واقعی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے علم و فضل کو کوئی نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو بصیرت دی ہے کسی کو نہیں ملی۔ لیکن جب ہم نے انہیں لکھا کہ یہ جو آپ نے بار بار خودی کی طرف اشارہ کیا ہے تو ہم نہیں سمجھے خودی کیا ہے؟ ہمیں سمجھا دیجئے۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا، ہمارے پاس کبوتروں کا ایک نہایت اعلیٰ جوڑا ہے، اجازت ہو تو آپ کی خدمت میں پیش

کر دیا جائے۔ اتنا کہہ کر مولانا نے سامعین کی طرف دیکھا اور کہنے لگے ہم ان کا مطلب سمجھ گئے۔ مولانا شدت سے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ حضرت علامہ شاید انہیں یہ سمجھا رہے تھے کہ جس چیز کے بارے میں آپ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں وہی بار بار اور نئے سے نئے روپ میں آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ یہی خودی ہے"۔

موسیقی سے دلچسپی کا آغاز بھی بچپن سے ہوا اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے۔ اس کا پتہ یوں ملتا ہے کہ سیالکوٹ کی اقبال منزل میں اقبال کی جو درسی کتب محفوظ ہیں، ان میں نویں جماعت کی کتاب READINGS OF POETRY میں دو مقامات پر اپنے ہاتھ سے راگ کے بول تحریر کئے۔

سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا

کھرج رکھب گندھار مدھم پنچم دھیوت نکھاد

دوسری جگہ یہ بول درج ہیں

دھا کھرج (خاص) ری گا دھا (خاص)

پا (خاص) گا ری سا ری گا

1895ء میں اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔ چونکہ سکاچ مشن کالج میں اس وقت تک بی اے کی تدریس کا اجرا نہیں ہوا تھا، اِس لئے اقبال کو اعلیٰ تعلیم کیلئے لاہور بھیج دیا گیا اور یوں ان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

لاہور میں تعلیم کا دوسرا مرحلہ

اقبال لاہور کی کھلی فضاؤں میں آئے تو ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئے جو سیالکوٹ کی دنیا سے بہت مختلف تھی۔ یہ شہر مشرق و مغرب کا امتزاج پیش کرتا تھا۔ ایک طرف اندرون شہر کی گہما گہمی جس کے سینے میں مشرقی روایات اور انداز زندگی سے پیار کا جذبہ موجزن تھا۔ دوسری طرف چھاؤنی سے لیکر گورنمنٹ ہاؤس تک کا علاقہ، جو ڈونلڈ ٹاؤن کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جہاں سفید فام صاحبان عالی مقام آباد تھے۔ اس کے پہلو میں لارنس باغ اور چڑیا گھر، جو سیر و تفریح کے مراکز تھے اور پھر مال روڈ۔۔۔ جس پر لارنس ہال اور منٹگمری ہال میں گوری نسل کے لوگ رقص وسرور اور نائے نوش کی محفلیں گرم کرتے تھے۔ اس شاہراہ کو ٹھنڈی سڑک کہتے تھے۔ یورپی تاجروں

نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ گوری نسل کے لوگ یہیں خرید و فروخت کرتے تھے۔ نیلا گنبد سے مشرقی زندگی کا آغاز ہوتا تھا۔ انارکلی بازار موجود تھا لیکن اس میں رونق بہت کم تھی۔ مال روڈ اور پرانے شہر کے درمیان تعلیمی دنیا آباد تھی۔ پنجاب یونیورسٹی وجود میں آ چکی تھی۔ سینٹ ہال بن چکا تھا اور گورنمنٹ کالج کی موجودہ عمارت اِس سال مکمل ہو چکی تھی جس سال اقبال نے سیالکوٹ میں جنم لیا۔ اورینٹل کالج اور لاء سکول بھی اسی عمارت میں مرتکز تھے۔ نیلا گنبد کے قریب ہی میڈیکل کالج اور فورمین کرسچیئن کالج واقع تھے اور عجائب گھر کے قریب میوسکول آف آرٹس موجود تھا۔

جن دنوں اقبال گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے، اس کالج میں ان مضامین کی تدریس کا بندوبست موجود تھا، انگریزی زبان و ادب، عربی، فارسی اور سنسکرت، تاریخ و معاشیات، ریاضی، فلسفہ اور طبعی علوم، تین کورس ہوتے تھے۔ اول: دو سالہ انٹرمیڈیٹ کورس، جس میں کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوم: بی اے کا دو سالہ کورس، جس میں تین یا چار مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ سوم: ایم اے کا ایک سالہ کورس، جس میں ادب یا سائنس کی کسی ایک شاخ میں تخصص مطلوب تھا۔ کالج میں یہ اساتذہ کام کرتے تھے: (۱) پی جی ڈانجر، پرنسپل۔ (۲) جی بی اوشر (فلسفہ)۔ (۳) لالہ جیارام (تاریخ و فلسفہ)۔ اقبال نے بی اے میں فلسفہ لالہ جیارام اور پروفیسر اوشر سے پڑھا۔ انگریزی میں تعلیم ڈانجر سے حاصل کی ہوگی۔ السنہ شرقیہ کی تدریس اورینٹل کالج کے اساتذہ کے سپرد تھی۔ اس لئے اقبال نے عربی کی تعلیم مولوی محمد دین سے حاصل کی جو اس کالج میں عربی کے اُستاد تھے۔ مارچ 1897ء میں اقبال نے بی اے کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ یونیورسٹی کے کل امیدواروں میں ان کی پوزیشن گیارھویں تھی لیکن یہ کہنا نادرست نہیں کہ اقبال نے بی اے کے امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی کیونکہ انہیں دو تمغے ملے۔ اول جمال الدین میڈل، جو عربی کے امتحان میں اول آنے پر ملا۔ دوم: خلیفہ محمد حسین ایچی سن میڈل، جو انگریزی اور عربی کے امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر حاصل ہوا۔ بی اے کے امتحان میں کامیابی کے بعد اقبال نے اِسی سال ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اِس زمانے میں ایم اے کورس ایک سال کا ہوتا تھا۔ اِس اعتبار سے اقبال کو 1898ء میں ایم اے کر لینا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، وہ یا تو ناکام رہے یا انہوں نے امتحان ہی نہ دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی بتاتے ہیں کہ امتحان میں نہ بیٹھنے کی بہ

ظاہر کوئی قرینہ نہیں۔ راقم الحروف کو اس سے اختلاف ہے چونکہ دستاویزات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایم اے کے ساتھ ساتھ لاء میں داخلہ بھی مل جاتا تھا اور یہ دونوں امتحان ایک ہی سال دینے کی اجازت تھی۔ اقبال نے بھی 1897ء میں بیک وقت ایم اے فلسفہ اور لاء میں داخلہ لیا اور 1898ء میں لاء کا امتحان دیا۔ عین ممکن ہے کہ اقبال نے دو امتحانوں کو بوجھ تصور کر کے صرف ایک امتحان دیا ہو اور اس طرح ایم اے فلسفہ کے امتحان میں نہ بیٹھے ہوں۔

یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ فلسفے کے شہرہ آفاق پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کرلیا اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے۔ ان کا تقرر 11 فروری 1898ء کو ہوا اور اقبال ان سے درس لینے لگے۔ ''پروفیسر آرنلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے'' سالانہ امتحان میں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ رہ گیا تھا۔ ایسے میں اقبال نے سوچا ہوگا کہ امتحان میں ناکام رہنے سے بہتر ہے کہ اس میں اس سال بیٹھا ہی نہ جائے۔ پروفیسر آرنلڈ کے زیر سایہ تربیت پانے کے بعد اقبال نے 1899ء میں ایم اے کا امتحان دیا۔ اس سال صرف ایک ہی امیدوار کامیاب ہوا۔ وہ اقبال تھے۔ اقبال سے پروفیسر آرنلڈ کے رشتے کے بارے میں سر شیخ عبدالقادر نے 1924ء میں جو سطور قلمبند کیں، وہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر کے بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

''انہیں علم فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا اور انہیں لاہور کے اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا جس سے فلسفے کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ پروفیسر آرنلڈ ۔۔۔ غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔ قوت تحریر ان کی بہت اچھی تھی اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوف واقف ہیں۔ اُنہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرزِ عمل سے حصہ دیں۔ پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہاں ایک اور جوہر قابل نظر آیا جس کے چمکانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور جو دوستی اور محبت اُستاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخرش شاگرد کو اُستاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے

گئی اور وہاں یہ رشتہ بھی مضبوط ہو گیا اور آج تک قائم ہے۔ آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لئے باعث شہرت افزائی ہوا اور اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا، اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔ لاء کے امتحان میں اقبال کامیاب نہ ہو سکے۔ شاید اِسی لئے کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھا ہوا تھا۔ ایم اے میں بھی اور لاء میں بھی۔ ایم اے کا امتحان مارچ 1899ء میں ہوا اور لاء کا دسمبر 1898 میں۔ ایم اے پر زیادہ توجہ رہی، اِسی لئے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لاء پر توجہ میں کمی رہ گئی، اس لئے پانچ پرچوں مین تو کامیاب ہو گئے اور فقہ کے پرچے میں ناکام رہے۔ سید محسن ترمذی نے ہائیکورٹ کی پرانی دستاویزات کی چھان بین کے بعد انکشاف کیا کہ جون 1900ء کے لاء کے امتحان میں بیٹھ جاؤں لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ یہ انکار اقبال کی زندگی میں ایک نئے موڑ کا آغاز ثابت ہوا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے ملک کے اندر لاء کے مطالعہ کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دیا اور فیصلہ کیا کہ سمندر پار جائیں۔ چنانچہ 1905ء سے 1908ء تک کا عرصہ باہر گزارا اور اس دوران میں نابغہ روزگار فضلاء کی صحبت سے فیض حاصل کرتے رہے۔

تکمیل تعلیم کے تذکرے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کے مشاغل زمانہ میں کس نوعیت کے تھے اور وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے اقبال کو اقبال بننے میں مدد دی۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ اس زمانے کے شہر لاہور کی ثقافت وتہذیب کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کر دیا جائے۔ اس زمانے کا لاہور روشنیوں سے جگ مگ جگ مگ کرتا شہر نہیں تھا کہ ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ گھروں اور دوکانوں میں روشنی کا ذریعہ پیتل کے پرانے شمعدان یا مٹی کے چراغ تھے۔ مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹین اور گلوب نما لالٹین کا نیا نیا رواج چلا تھا۔ انہیں پہلے ریلوے اسٹیشن پر نصب کیا گیا اور پھر کچھ مرفع الحال گھرانوں نے بھی اپنا لیا۔ لاہور کی کل آبادی ایک لاکھ 76 ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔ جس میں ایک لاکھ سوا دو ہزار مسلمان تھے، 62 ہزار سے کچھ زیادہ ہندو، 7 ہزار 3 سو سکھ، 4 ہزار 7 سو عیسائی اور باقی دوسرے فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ۔ اندرون شہر میں تفریحات کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے بچے گولیاں کھیلتے تھے۔ نوجوان اکھاڑوں میں جاتے، ڈنڈ نکالتے اور کشتی لڑتے تھے۔ جا بجا مرغ، بلبل اور بٹیر لڑانے کے مقابلے ہوتے۔ پتنگ بازی کا

شوق بھی عام تھا۔بیرون شہر کالجوں اور سکولوں میں کرکٹ محبوب کھیل تھایا طلبا انگریزی آلات کی مدد سے ورزش جسمانی کا شغل اختیار کرتے تھے۔کوئی تھیٹر نہیں تھا۔کوئی سینما نہیں تھا۔کوئی نمائش نہیں ہوتی تھی اور کسی قسم کے ثقافتی شو کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔مسلمانوں اور ہندوؤں کی انجمنیں الگ الگ تھیں۔مسلمانوں کی انجمنوں میں انجمن اسلامیہ سرفہرست تھی جو 1886ء میں قائم ہوئی اور جس کے اہتمام میں ایک اسلامیہ ہائی سکول چل رہا تھا۔سید امیر علی کی قائم کردہ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی ایک شاخ موجود تھی اور تہذیبی زیادہ۔ان انجمنوں کا کام کاج امرائے کرام چلاتے تھے۔عوام کو ان میں کوئی خاص عمل دخل حاصل نہیں تھا۔سوائے اِس کے کہ چندہ دے دیا یا کبھی کوئی عام اجتماع ہوا تو اس میں شرکت کر لی۔مباحثوں، مناظروں اور تقریری مقابلوں کیلئے نوجوانوں کی ایک انجمن ینگ محمڈن ایسوسی ایشن کے نام سے 1891ء سے قائم تھی۔اس کے ارکان کی تعداد 98 تھی اور میاں شاہ دین بار ایٹ لاء اور سید خورشید انور سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔اِس انجمن کی تقریبات شاذ ہی ہوتی تھیں۔کچھ اور انجمنیں بھی قائم تھیں جن کا مقصد تھا محدود دوائر میں اصلاح معاشرہ کیلئے سعی۔یہ انجمنیں مشاعرے بھی برپا کیا کرتی تھیں۔اخبارات موجود تھے لیکن بہت کم۔لاہور کا واحد انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' تھا لیکن یہ سفید فام حضرات کی دلچسپی کی چیز تھا، اِس لئے اشاعت چودہ سو کے لگ بھگ تھی۔انگریزی کا واحد ہفت روزہ ''ٹربیون'' تھا جو ہندوؤں کے جذبات کی عکاسی کرتا تھا۔اردو روزنامے دو تھے۔''اخبار عام اور'' پیسہ اخبار'' موخر الذکر مسلمانوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ان اخباروں کو اخبار کہنا شاید مناسب نہ ہو، اخبارچے کا لفظ شاید زیادہ موزوں ہو، اس لئے اشاعتیں زیادہ نہیں تھیں۔البتہ ''پیسہ اخبار'' کا ہفت روزہ ایڈیشن کثیر الاشاعت تھا۔

اِن حالات میں پڑھے لکھے لوگوں کیلئے فرحت کے مشغلے تین ہی ہو سکتے تھے۔سیر، احباب کی محفلوں میں گپ زنی یا کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ۔ادیبوں کیلئے مشاعروں میں شرکت بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہو سکتی تھی۔علامہ اقبال سیر یا گھومنے پھرنے کے قائل نہیں تھے اور بقول میر غلام بھیک نیرنگ ''اقبال کی طبیعت میں اسی وقت سے ایک گونہ قطبیت تھی۔اِسی لئے دو ہی مشغلے تھے، محفل احباب میں گپ زنی اور مطالعہ۔جب لاہور آئے تو سب سے پہلے بھاٹی دروازے

کے اندر شیخ گلاب دین مرحوم کے مکان میں سکونت اختیار کی۔
اتنے میں اقبال کو گورنمنٹ کے اس دارالاقامہ میں ایک کمرہ مل گیا جو آج کل کواڈینگل ہوسٹل کے نام سے مشہور رہے۔ غلام بھیک نیرنگ اقبال سے جونیئر تھے اور اسی ہوسٹل میں مقیم تھے۔ نیرنگ اِس زمانے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

''میں اور کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو جوان کے دوست تھے، سب انہی کے کمرے میں ان کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ وہ وہیں فرش بنے بیٹھے رہتے تھے۔ حقہ جھبی سے ان کا ہمدم و ہم نفس تھا۔ برہنہ سر، بنیان در بر، ٹخنے تک تہہ بند باندھے ہوئے اور اگر سردی کا موسم ہےتو کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے اور ہر قسم کی گپ اُڑاتے رہتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ پھبتی زبردست کہتے تھے۔ ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ شعر کہے بھی جاتے اور پڑھے بھی جاتے تھے''۔

جب اقبال نے ایم اے کرلیا اور نیرنگ نے بی اے کرلیا تو دونوں نے ہوسٹل چھوڑ دیا اور یوں شب و روز کی محفلیں ختم ہوگئیں۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے غلام بھیک نیرنگ بتاتے ہیں۔

''اِس ابتدائی زمانے میں کسی کو بھی اقبال میں ایک اچھے شاعر، مگر عام معیار کے شاعر کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ یا اگر آپ اجازت دیں تو یہ کہوں کہ دیکھنے والوں کی کوتاہ نظری نہ تھی بلکہ اس وقت وہ چیز موجود ہی نہ تھی جو بعد میں بن گئی۔ شمس العلماء سید میر حسن مرحوم و مغفور کی تربیت سراسر ادبی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ کا فیض تعلیم مطالعہ فلسفہ و تحقیق کا رہنما ہوا۔ تصوف کی بنیاد گھر میں پڑ چکی تھی کہ اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اصل سرچشمہ، جہاں سے اقبال نے تلاش حق کی، کبھی نہ بجھنے والی پیاس کو بار بار تسکین دی، قرآن حکیم ہے، رسول کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے''۔

1890ء کا ذکر ہے حکیم احمد شجاع مرحوم کے والد حکیم شجاع الدین محمد نے بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں انجمن اتحاد کی بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام مجالس مشاعرہ برپا ہونے لگیں۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے حکیم امین الدین بیرسٹر کے دولت کدے پر منعقد ہوتا تھا اور جو طرحی اور غیر طرحی کلام پڑھا جاتا تھا، ماہنامہ ''شور محشر'' میں شائع ہو جاتا تھا۔ شعراء میں رقابت کا بازار بھی گرم تھا۔ مرزا ارشد گورگانی دبستان دہلی کے حامی تھے اور میر ناظر حسین ناظم دبستان لکھنؤ کی

نمائندگی فرماتے تھے۔ ''دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کیلئے مصروف غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی میر اور میرزا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعراء میں میر اور میرزا کے زیر قیادت میدان سخن طرازی میں ایک دوسرے مصروف پیکار رہتے تھے۔'' اقبال نے اپنی پہلی غزل اِسی مشاعرہ میں پڑھی اور جب یہ شعر سنایا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی اُچھل پڑے اور کہنے لگے: اقبال اِس عمر میں یہ شعر؟ یہاں سے اقبال کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا اور وہ وقتاً فوقتاً اس مشاعرے میں اپنا کلام سناتے رہے ایک محفل میں داغ کی شاعری پر یوں اظہار فخر کیا۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخن داں کا

اِس دن منشی محمد الدین فوق سے اقبال کی ملاقات ہوئی۔ ''ذوق و مشرب سے یگانگی کی بناء پر دونوں کی طبیعت مل گئی اور ان میں کچھ ایسی اُلفت و محبت ہوگئی جسے جیتے جی زمانے کی دست برد کوئی گزند پہنچا نہ سکی''۔ منشی محمد الدین فوق ہی نے اقبال کو 1896ء میں انجمن کشمیری مسلمانان ہند کی پہلی مجلس میں بلایا اور انہی کی تحریک پر اقبال نے پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا ''کیا تھا گردش ایام نے مجھے مخزوں،،۔ 1899ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجتماع میں اقبال نے اپنی نظم ''نالہ یتیم'' ترنم کے ساتھ سنائی تو اس پر ہزاروں سامعین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی۔

27 مارچ 1898ء کو سرسید احمد خان اللہ کو پیارے ہوئے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ ''اگر چہ سرسید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں۔ ایک غفرلہ اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت: **انی متوفیک و رافعک والی مطھرک**۔'' اِس سلسلے میں سالک، سید ذکی شاہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ جب سرسید فوت ہوئے تو اقبال

چند دنوں کیلئے سیالکوٹ میں آئے ہوئے تھے۔مولانا میر حسن نے سرراہے اقبال سے کہا، ذرا تاریخ کی فکر کرنا۔اقبال نے ذکی شاہ کے ہاتھ یہ تاریخ وفات لکھ بھیجی **انـــــی متـــوفیک ورافعک والی مطھرک**۔میر حسن نے سنی تو کہا خوب ہے۔میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے: **غفرله**۔''حیات جاوید''میں دونوں تاریخیں تو آ گئیں لیکن نام کسی کا بھی درج نہیں تھا۔میر حسن نے حالی کو شکایتی خط لکھا تو اُنہوں نے معذرت کر بھیجی اور کہا، مجھے ناموں کا علم نہ ہو سکا۔اب انشاءاللہ دوسرے ایڈیشن میں نام ضرور لکھ دوں گا۔بہر حال وہ یہ وعدہ ایفا نہ کر سکے۔

''1901 سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔اِس بزم میں ان کو چند ہم جماعت کھینچ کر لائے تھے اور انہوں نے کہہ سن کر غزل بھی ان سے پڑھوائی۔اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔چھوٹی سی غزل تھی، سادہ الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا، بہت پسند کی گئی۔اسکے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ میں انہوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔مگر یہ شہرت پہلے پہلے لاہور کے کالجوں کے طلباء اور بعض اور ایسے لوگوں تک محدود رہی جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے۔اتنے میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے اور نظم ونثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی۔شیخ محمد اقبال نے اس کے اس جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں کوہ ہمالیہ سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی۔اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں، اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی، مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی۔

۱۸انیسویں صدی اپنی بساط لپیٹنے کیلئے پرتول رہی تھی۔بیسویں صدی کی آمد آمد تھی۔وہ جوان رعنا، جو اٹھارہ برس کی عمر میں لاہور آیا تھا، دنیاوی اعتبار سے کامیاب تھا کہ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔شعر وشاعری میں نکھار آنے لگا اور ادبی حلقوں میں جان پہچان ہو گئی۔اب پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کے ایک نئے موڑ پر کھڑا تھا۔

سر زمین موسیٰ

(مولانا محمد الیاس اظہر الازہری)

لباس

مردوں میں تین قسم کا لباس مروج ہے۔ایک خالصتاً یورپین یعنی پتلون ،شرٹ ،نکٹائی اور بوٹ وغیرہ جیسے ہمارے ہاں بعض خوشحال لوگ اور خاص کر ہمارے بیوروکریٹ ہیں ۔تاہم نمازیہ لوگ بھی پڑھتے ہیں اگر چہ ان کی تعداد کم ہے مگر پڑھتے اِسی لباس میں ہیں اور بعض مساجد کی امامت اور خطابت بھی اِسی لباس میں کرتے ہیں جبکہ سر بھی ننگا ہی ہوتا ہے۔دوسرا لباس قدیم مصری عربی طرز کا ہے۔یعنی ایک لمبا عربی کرتا جسے ’’توپ‘‘ کہتے ہیں نیچے پاجامہ اور سر پر خاص قسم کی ٹوپی جو مردی بھی اور عورتیں بھی کروشیے سے بنتی رہتی ہیں ۔اس پر بعض پینیڈو قسم کے مصری گلوبند ،مفلر یا رول پگڑی کی طرح باند لیتے ہیں۔اور ہمارے پٹھانوں یا پنجابی چودھریوں کی طرح ایک مفلر اور چادر یا پٹکا سا کندھے اور گلے کے گرد لپیٹ لیتے ہیں۔تیسرا لباس پڑھے لکھے خوش باش دیندار لوگوں کا ہے۔وہ ایک لمبا اجلا عربی کرتا۔بعض اوقات سر پر سفید ٹوپی نیچے پاجامہ ۔یہ لباس گریجویٹ اس سے اوپر کی سطح کے دینی ذہن رکھنے والے نوجوان اور بڑے بوڑھے شوق سے پہنتے ہیں ۔اِس کے علاوہ ایک مخصوص لباس ازہری علماء کا ہے جس کا ذکر علماء کے تذکرے میں آئے گا۔

آپ خواتین کو لباس کے لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ایک مغرب زدہ طبقہ جیسا اپنے ہاں ہے مگر ان کی دو قسمیں ہیں۔مسلم اور غیر مسلم مسلم خواتین اور طالبات لمبی سکرٹ جو پنڈلیوں تک ہوتی ہے اور بعض لمبی جرابیں بھی پہنتی ہیں یا شاید یہ جنوری کے مہینے میں گرمی سے بچنے کیلئے ہوں گی ۔جبکہ غیر مسلم خواتین گھٹنے تک لمبی یا خال خال منی سکرٹ بھی پہنتی ہیں۔سر دونوں کے ننگے اور بال تراشیدہ ،ناخن بڑھے ہوئے اور ہر وقت میک اپ سے لپی پوتی رہتی ہیں ۔دوسرا گروہ قدیم مصری لباس والیوں کا ہے ۔میں انہیں پنڈوریاں بھی کہہ سکتا ہوں ۔کیونکہ اُنہوں نے ہماری پٹھانیوں کی طرح لمبا کالا چغہ ،لمبا کرتا ۔جو عموماً سیاہ ہوتا ہے۔بال گندھے ہوئے ۔سر پر ایک آدھ بچہ اُٹھائے ہوئے جیسے ہمارے گوجرانوالہ کے دال بازار میں دیہاتی خواتین ہوتی ہیں ۔تیسرا گروہ دوان پڑھ لکھی ملازمت پیشہ خواتین یا طالبات کا ہے جو دین سے بھی لپٹی ہوئی ہیں اور معاشی بدحالی کا مقابلہ بھی کر رہی ہیں ۔ان کے دو زمرے ہیں ۔ایک وہ جو فقہ شافعیہ کی آڑ میں ہتھیلیوں اور چہرے کو پردے میں داخل نہیں سمجھتیں مگر ہیں پکی دیندار۔ اُنہوں نے موٹے کپڑے کا ایک لمبا اور ڈھیلا ڈھالا چغہ نما فراک پہنا ہوتا ہے جو ٹخنوں سے نیچے تک ہوتا ہے ظاہر ہے اِس کے نیچے زیر جامہ بھی ضرور ہوگا ۔سر پر سفید یا کسی سادہ رنگ کا ہلکا پھلکا دوپٹہ اس طرح پنیں لگا کر اوڑھتی ہیں کہ سر کے بال ،ماتھا ،کان ،گردن اور سینہ مکمل ڈھک جاتا

ہے۔آنکھیں سرمے یا کاجل سے بے نیاز، چہرہ ہلکے سے میک اپ سے بھی پاک اور ناخن سنت کے مطابق کاٹے ہوئے۔سر کے بال پورے لیکن یہ جنت کی حوریں عفت مآب بیٹیاں اور بہنیں دل سے اس بات کی قائل ہیں کہ جب بھی حالات سازگار ہوئے تو وہ چہرہ بھی ڈھانپ لیں گی۔ لیکن ایک چوتھی قسم وطن عزیز کی طرح یہاں بھی موجود ہے جو کٹر قسم کی اخوانی یا آج کل کی نئی اصطلاح میں بنیاد پرست مسلم خواتین ہیں جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کر کے اس پر عمل کرنا مقصد حیات بنا رکھا ہے۔انہوں نے چہرے کو اس طرح ڈھانپ رکھا ہوتا ہے کہ صرف چادر کی چھوٹی سے درز سے آنکھیں کھلی رکھتی ہیں۔جیسے ہمارے ہاں دینی مدارس کی طالبات نے برقعہ پہن رکھا ہوتا ہے اور پاؤں جرابوں سے اور ہاتھ سیاہ دستانوں سے چھپا رکھے ہوتے ہیں۔بسوں میں مردوں کیساتھ بالکل نہیں بیٹھتی ہیں۔ایک مصری طالب علم دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ کہ یہ اخوانی خواتین اتنی کٹر مذہبی ہوتی ہیں کہ اگر منگنی ہو چکنے کے بعد اس کا منگیتر ڈاڑھی منڈوا دے تو وہ منگنی کی انگوٹھی واپس بھجوا کر منگنی توڑ دیتی ہیں۔ایسے ہی لوگوں کی بدولت دین قائم ہے۔

نظام تعلیم

مصر کا نظام تعلیم پاکستان کی طرح تہرا ہے۔صرف فرق یہ ہے کہ یہاں وطن عزیز میں انگلش میڈیم ہے جبکہ وہاں مصر میں اسے فرنچ میڈیم بھی کہہ سکتے ہیں۔دوسرا نظام سیکولر یا لا دین ہے جیسے وطن عزیز میں سرکاری مدارس کا نصاب اور یونیورسٹیوں کا مخلوط یا غیر مخلوط نظام ہے۔تیسرا نظام ازہری معاہدہ کا ہے جو پورے ملک میں شہروں سے دیہات تک پھیلا ہوا ہے اور اسے جامعہ ازہر کنٹرول کرتی ہے۔یہ نظام بڑا انرالا ہے اس سے پورے ملک میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی لہر آئی ہوئی ہے اسی کا اثر ہے کہ عین الشمس اور قاہرہ یونیورسٹی جیسے مخلوط اداروں میں بھی لڑکیاں حجاب کرنے لگی ہیں حالانکہ قاہرہ یونیورسٹی تو بالکل یورپین طرز کی ہے۔میرے خیال میں یہ سارا کارنامہ اخوان کے علاوہ دیگر مذہبی گروہوں مثلاً تبلیغی جماعت، سلفی جماعت اور تنظیم جہاد کے ساتھ ساتھ ازہری مدارس کا بھی ہے۔پرائمری سے یونیورسٹی تک ازہری نصاب اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ عربی زبان و ادب، قرآن، حدیث، تفسیر، اصول فقہ، صرف و نحو، فقہ، منطق و فلسفہ اور تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ جدید ترین سائنسی اور صنعتی علوم پر مشتمل نصاب بھی سکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے اور بالکل قاہرہ یونیورسٹی کی طرح ہاسٹل کی سہولتیں، کھیل کے میدان، لائبریریاں اور دیگر تمام جدید سہولیات میسر ہیں۔اس وقت الازہر یونیوسٹی کے تحت میڈیکل کالج برائے خواتین اور میڈیکل کالج بوائز کے علاوہ کلیۃ الہندسہ یعنی انجینئرنگ کالج اور

کلیۃ الزراعۃ یعنی زرعی کالج بھی کام کر رہا ہے اس کے علاوہ کئی اور کالج بھی ہیں۔نتیجتاً شرح خواندگی تقریباً 65فیصد ہے اور الازہر سے فارغ التحصیل ایک انجینئر یا ڈاکٹر بہت بڑا خطیب، محدث، مفسر اور مبلغ بھی ہوتا ہے۔کاش یہ جدوجہد قدیم کا حسین امتزاج ہمارے ملک میں بھی نافذ ہوسکے تاکہ ہمارے علماءدین فکر معاش سے یکسر آزاد ہو کر دین کی بہتر خدمت کرسکیں۔

جامعہ ازہر کے متعلق تفصیل سے پوری تاریخ کا خلاصہ جس میں ایک جامع مسجد سے جامعہ یعنی یونیورسٹی بننے تک کے تمام مراحل کا ذکر اپنے سفر نامے میں مناسب موقع پر زیب قرطاس کیا جائے گا۔

ذرائع نقل وحمل

اِس تمہید کے آخر میں تھوڑا سا ٹریفک اور ذرائع نقل وحمل (آمد و رفت) کے متعلق بھی عرض کر دوں تو قارئین کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوگا۔شہر قاہرہ کے اندر سرکاری انتظام کے تحت منی بس، ٹرام، میٹرو ٹرین (جو زیر زمین چلتی ہے۔) بڑی بڑی لانچوں کا ایک بیڑا جو درحقیقت اومنی بس سروس یا ہیئۃ النقل العام کے زیر انتظام دریائی ٹرانسپورٹ کو کنٹرول کرتا ہے کے علاوہ چھوٹے جہاز، ہلکی پھلکی سیاحتی کشتیاں جو زیادہ تر ڈیزل انجن سے چلتی ہیں۔کرایہ پر چلنے والی ٹیکسیاں، ٹورسٹوں کیلئے خاص طور پر چلنے والی بڑی بڑی آٹو میٹک ایئر کنڈیشنڈ کوچیں اور پرائیوٹ کاریں، ویگنیں اور انڈیا کی مدد سے بنایا جانے والا اسکوٹر یا موٹر سائیکل بھی عام ہے۔لیکن وطن عزیز کے خاص تحفے یعنی سائیکلیں، تانگے اور راولپنڈی میں چار پہیوں والی قینچیاں جنہیں اونٹ کھینچتے ہیں وہاں انہیں گھوڑے کھینچتے ہیں۔ٹوٹی پھوٹی ویگنوں کے علاوہ سوزوکی پک اپ اور ''کھوتی ریڑھی'' (جسے میں صرف پاکستان کی ایجاد ہی سمجھتا تھا) یہاں اس کی ترقی یافتہ شکل اس طرح دیکھی کہ ساتھ دو یا تین سہیلیاں مزید اس کا بوجھ بانٹنے یا دل بہلانے کیلئے سارا دن اس ریڑھی کے ساتھ بھاگتی رہتی ہیں۔سڑکیں تمام گاڑیاں وغیرہ بالکل پاکستان کی نقل ہیں۔یعنی سڑکیں ٹوٹی ہوئی اور گندی۔چوکوں اور چوراہوں میں کچرا۔بسیں اور ٹرام میں بالکل اپنی تر پڑ میل اربن ٹرانسپورٹ کی طرح۔البتہ ''میٹرو'' پر سفر کرنے کا مزا آ گیا۔آٹو میٹک دروازوں اور آرام دہ سیٹوں کے علاوہ سبک رفتار اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک یہ نظام بہت پسند آیا۔اگر چہ اس کا کرایہ دوسری تمام ٹرانسپورٹ سے نسبتاً زیادہ ہے۔یہ قاہرہ کے اندر شمالاً جنوباً چلتی ہے۔جنہیں ''میدان التحریر'' یا آزادی چوک جو کہ عجائب گھر سے متصل ہے اور ''میدان رعمیس'' جو کہ قاہرہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے اس کے درمیان میں پتھر کا تراشا ہوا فرعون کا دیو ہیکل بت نصب ہے جسے اسوان ڈیم

کے مقام سے اقوام متحدہ کی مدد سے بڑی بڑی کرینوں کے ذریعے اُکھاڑ کر یہاں پہنچایا گیا اور پھر نصب کیا گیا۔ اسی فرعون چوک میں اخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البنا شہید کو گولی ماری گئی تھی۔ یہ بت گذشتہ سال کے زلزلے میں ٹوٹ گیا تھا۔

مصریوں کی جمعرات

کہ ایک دن جمعرات تھی ہم نے سوچا کی لگے ہاتھوں کسی اہم شخصیت کے مزار پر جانا چاہئے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ مصری بھائی اپنی جمعرات کیسے مناتے ہیں۔ کیونکہ وطن عزیز میں تو اس روز مزارات اولیاء پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ چنانچہ فاروقی صاحب کیساتھ پیدل ہی پہلے ''الحسین'' پہنچے۔ مسجد کے شمال کی جانب ''دورۃ المیاہ'' یعنی طہارت خانے ہیں۔ جب استنجا سے فارغ ہوئے تو باہر بیٹھے ہوئے ایک مشٹنڈے نے پیسے طلب کئے (جیسے اپنے ہاں سرکاری لیٹرینوں کے باہر ایک دو عیسائی بیٹھے ہوتے ہیں اور فی کس دو روپیہ فی پھیرا معاوضہ لیتے ہیں) غصہ تو بہت آیا کہ انہوں نے مسجد میں بھی استنجا ٹیکس لگا رکھا ہے۔ خیر اسے ایک خوش پوش مصری نے دھتکار کر میری جان اور جیب چھڑائی۔ اس کے بعد جب وضو خانے میں داخلے کے بعد باہر آئے تو یہاں بیٹھے ہوئے ایک بر چھے نے بھی وضو ٹیکس وصول کرنا چاہا۔ اِسے برا بھلا کہتے جوتا اُٹھا کر بلا معاوضہ باہر نکل آیا۔ قبل ازیں ہر زیارت گاہ پر پیشہ ور بھکاریوں یا منگتوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ اس لئے میں محتاط تھا۔ مگر آج خانہ خدا میں خالص عبادت پر معاوضہ مانگنے کی وجہ سے بہت غصہ آیا۔ بہرحال مسجد میں داخل ہوئے تو نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم صفوں میں بیٹھ گئے۔ اتنی بڑی مسجد میں جہاں نواسہ رسول ﷺ کی نسبت سے بڑی رونق رہتی ہے نمازیوں کی قلت دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا۔ ایک کلین شیو موذن نے بالکل ''اٹین شن'' پوزیشن میں اذان دی یعنی ہاتھ کھلے چھوڑ کر انگلیاں کانوں میں دیئے بغیر۔ اس کے بعد اپنے ملک کے بریلوی حضرات کی طرح صلوۃ وسلام پڑھا۔ اس کے بعد اقامت ہوئی اور جماعت کھڑی ہوگئی۔ نماز کے بعد اِسی موذن نے کچھ وظائف وغیرہ بلند آواز میں پڑھے اور پھر باآواز بلند کہا ''الفاتحہ'' اس کے جواب میں تمام نمازیوں نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب امام حسین کو نذر کیا۔ اس کے بعد مزار کے اندر جا کر فاتحہ خوانی کی۔ ایک طرف عورتوں کا شور شرابہ اور باہر سے طبلہ نما ڈھولکی اور دیگر آلاتِ موسیقی کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ہر قسم کی تقریبات مثلاً شادی بیاہ یا محفل میلاد وغیرہ تمام خوشی کی رسومات ''الحسین'' میں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ عورتیں خوشی میں جب منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالتی ہیں تو ان کے ہونٹوں کے گول زاویوں کے اندر سرخ سرخ زبانیں ہلتی ہوئی نظر

آتی ہیں۔اور ان کے منہ سے ایسی آواز نکلتی ہے ۔جیسے موسم برسات میں ہمارے ہاں کھیتوں میں مینڈکیاں ٹراتی ہیں۔مزار سے باہر از ہر کے چوک تک چھوٹے چھوٹے کھوکھے ہیں جن میں بتاشے ریوڑیاں، کھجوریں، کاغذی پھول، تسبیحات اور دیگر اشیاء فروخت کی جاتی ہیں تا کہ لوگ انہیں بطور نذرانہ مزار پر چڑھائیں۔ہم جب یہ رونق دیکھ کر باہر نکلے تو کسی نے فاروقی صاحب کا نیا جوتا اُڑالیا۔اِس پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی۔

کہ جوتا چور مصر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ہمیں اس پر کڑھنا نہیں چاہئے کہ چوروں کی یہ قسم صرف پاکستان میں ملتی ہے۔بوجھل دلوں اور خالی پاکٹ کے ساتھ یہاں سے سیدھے سیدہ زینبؓ کی طرف روانہ ہوئے۔یہاں سے 666 نمبر بس سیدہ زینبؓ کی طرف جاتی ہے۔یہ پورا محلّہ اور چوک حضرت زینبؓ کے نام سے موسوم ہے جسے "سیدہ زینبؓ" کہتے ہیں۔ چوک میں اُتر کر مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ یہ مسجد بہت خوبصورت ہے۔اس کے اندر بائیں جانب حضرت زینبؓ بنت علی المرتضیٰؓ۔یعنی حضرت امام حسینؓ کی ہمشیرہ صاحبہ کا خوبصورت مزار ہے۔مسجد کی چھت سنگ مرمر کے 124 بڑے ستونوں پر ایستادہ ہے۔اوپر بڑی خوبصورت منقش چھت ہے۔مصری طرز کی دو محرابیں اور کئی منقش گنبد ہیں۔مزار مسجد کے شمال مغربی کونے میں ہے۔مزار پر خوبصورت گنبد ہے۔نیچے قبر کے اردگرد پیتل کی مستطیل مسقف جالی ہے جس پر سونے کی ملمع سازی کی گئی ہے۔مزار کے سرہانے کی طرف مندرجہ ذیل عربی اشعار کندہ کئے گئے ہیں۔

ازینب انت فی الدنیا کشمس
لھا نوی یضیئی ولا تغیب
ومن جاء المقام الیک یشفی
باذن اللّٰہ انت لہ طبیب
ومن برکات جسدک کنت دخرا
و قلب الزائرین ھنایطیب
ومن وصل المقام راک اھلاً
اباً اماً وعطفک زاعجیب
واکرمک الا لہ لکل شیء
ومن دخل المقام لہ نصیب

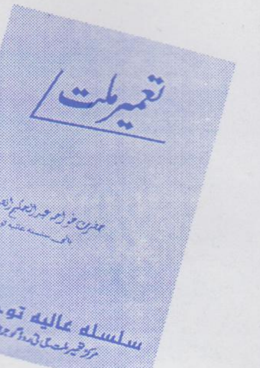
بجاہ المصطفی خیر البرایا
یجیئی الخیر والفتح القریب

ترجمہ! اے زینب تو دنیا میں اِس سورج کی طرح ہے جس کا نور اُجالا کرتا ہے اور کبھی غائب نہیں ہوتا۔ جو تیری قبر پر آتا ہے اللہ کے حکم سے شفا پاتا ہے اور تو اس کی طبیبہ ہے۔ تیرے جسم کی برکات یہاں ذخیرہ شدہ ہیں اور زائرین کا دل یہاں آ کر خوش ہوتا ہے۔ تیری شفقت بڑی عجیب ہے۔ تجھے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے نوازا ہے اور یہاں صاحب نصیب شخص ہی داخل ہو سکتا ہے۔ آنحضور ﷺ جو کہ ساری کائنات کے سردار اور سب سے افضل ہیں کے طفیل ہر بھلائی اور فتح بالکل قریب آ جاتی ہے"۔

اس کی دیوار پر اس کی تعمیر کنندہ کا نام اور دیگر معلومات لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے صرف نام ہی دیکھا کیونکہ کافی اونچائی کی وجہ سے صاف پڑھا نہیں جا تا تھا۔

"فی عہد صاحب الدولتہ خدیوی مصری الافخم محمد توفیق" یعنی عظیم خدیو مصر حکمران محمد توفیق پاشا کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یہاں سے فارغ ہو کر اسی محلے میں بالکل قریب ہی حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی سیدہ سکینہؓ کی مسجد اور مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ قریب ہی حضرت امام حسینؓ کی پھوپھی صاحبہ سیدہ رقیہؓ اور آنحضرت ﷺ کی پھوپھی صاحبہ سیدۃ عاقلہؓ اور حضرت امام جعفر صادقؒ کے صاحبزادے حضرت علیؓ کی مساجد اور مزارات بھی ہیں۔ ان پر فاتحہ خوانی کی۔ مسجد سیدہ سکینہ میں نماز مغرب ادا کر کے واپس ہاسٹل آ گئے۔ جمعرات ہونے کی وجہ سے زائرین کی کثرت تھی۔ مگر نمازیوں کی قلت تھی۔ معلوم ہوا کہ لوگ اپنی دنیوی پریشانیوں کا علاج مزارات میں مدفون ہستیوں سے کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی حال اپنے وطن عزیز میں بھی ہے۔ حالانکہ صاف حکم ہے۔ **واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ** یعنی ثابت قدمی اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ جتنے اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر وہ مستقل طور پر ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ مزارات کے باہر گداگروں، بھکاریوں، بے روزگاروں اور مختلف چیزیں بیچنے والوں کا زبردست ہجوم تھا۔ (جاری ہے)

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اوران کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اوراخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جوآپ نے سالانہ اجتماعات پرارشادفرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔

سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔

زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔

تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جولوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

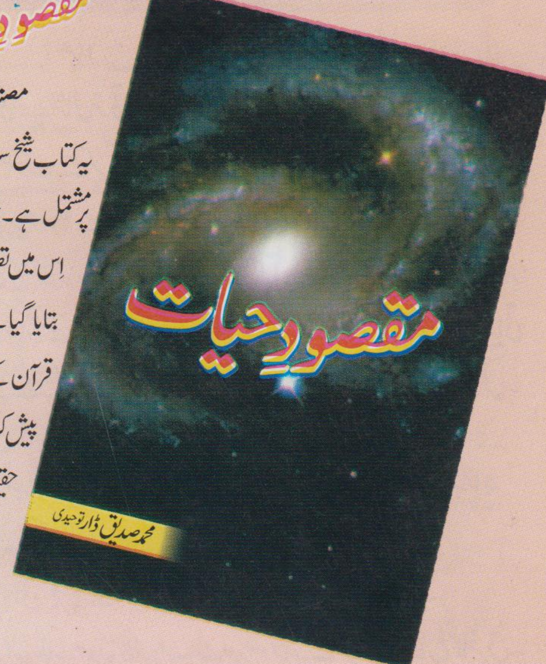


وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔

مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کردیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں :-

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

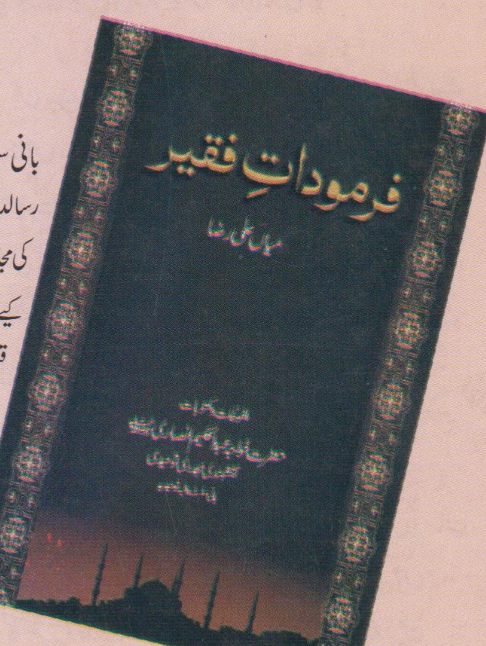
مکتبہ توحیدیہ کی مطبوعات



مقصودِ حیات

مصنف: محمد صدیق ڈار توحیدی (شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ)

یہ کتاب شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب کے سالانہ خطبات پر مشتمل ہے۔ جو اُنہوں نے سلسلہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے۔ اِس میں تصوف کی تعلیمات کو قرآن کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف اسلام اور قرآن سے باہر کی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ عین قرآن کے احکامات کا نام ہے اور قرآن جس طرح کے بندہ مومن کی تصویر پیش کرتا ہے وہ بلاشبہ ایک سچے صوفی کا ہی روپ ہے۔ قرآن پاک کے حقیقی پیغام کو آسان پیرائے میں سمجھنے کیلئے یہ کتاب سالکانِ راہ حق کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔



فرموداتِ فقیر

مرتب: میاں علی رضا

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ، خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ اور آپکے دوست اور محسن رسالدار محمد حنیف خاںؒ کی سوانح حیات کیساتھ اِس کتاب میں قبلہ انصاری صاحبؒ کی مجالس کا تذکرہ اور اپنے مریدوں کو مختلف اوقات میں لکھے ہوئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

قبلہ حضرت کی مجالس میں بیان کیے گئے چھوٹے چھوٹے واقعات نہایت سبق آموز اور راہ سلوک کے مسافروں کے علاوہ عام قارئین کیلئے بھی یکساں دلچسپی کا باعث ہیں۔ آپکے لکھے ہوئے جوابی خطوط میں بھائیوں کیلئے دینی ودنیاوی اور روحانی مشکلات کے حل کا سامان موجود ہے۔ نہ صرف اِن کیلئے جن کو یہ خطوط لکھے گئے بلکہ اب بھی ہر پڑھنے والے کیلئے فائدے کا سبب ہیں۔

Reg: SR - 01

Website: www.toheedia.net